ملاقات اُس مکان میں

نواں مجموعہ

جرائم، تفتیش اور سراغرسانی کی پانچ سچّی کہانیاں

احمد یار خان

فہرست

سات سانپوں کا زہر	۷
ملاقات اس مکان میں	۶۷
موت کا مینجر	۱۲۸
وہ طلاق سے ڈرتی تھی	۱۸۷
دل دیوانہ پیار کے پتھر	۲۴۹

پیش لفظ

محترم احمد یار خان کی پانچ کہانیوں کا ایک اور مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ہر مجموعے کے ساتھ پیش لفظ لکھنا ضروری تو نہیں ہوتا لیکن نئے قارئین کے لیے چند تعارفی جملے ضروری ہوتے ہیں۔ جو پڑھنے والے پاکستان میں پیدا ہوئے ہیں، انہوں نے پاکستان کی پولیس دیکھی ہے اور جرائم کی ایسی بھرمار جیسے اس ملک میں قانون ہے ہی نہیں۔ اُن کی نگاہ میں احمد یار خان اور محبوب عالم کی تفتیشی کہانیاں افسانے ہوں گے۔ وہ ذرا مشکل سے یقین کریں گے کہ کوئی تھانیدار اتنی محنت اور دیانتداری سے تفتیش کرتا ہو گا۔

یہ ہے بھی حقیقت کہ پاکستان میں تفتیش تو ہے لیکن سراغرسانی نہیں۔ مخبروں، وعدہ معاف گواہوں اور ایذا رسانی کے ذریعے لیے ہوئے اقبالی بیانوں کا سہارا لے کر مقدمہ تیار کیا جاتا ہے جو عدالت میں جا کر ناکام ہو جاتا ہے۔ اگر ملزموں کو سزا ہو بھی جاتی ہے تو وہ اپیلوں میں بری ہو جاتے ہیں۔

پاکستان میں جرائم کی ہوشربا بھرمار ہے۔ تھانیداروں کی کوشش ہوتی ہے کہ کیس رجسٹر ہی نہ کریں۔ اس کے علاوہ رشوت چلتی ہے۔ ملک میں جو سیاست رائج ہے یہ بھی کئی مجرموں کا تحفظ کرتی ہے۔ کچھ دلچسپیاں پولیس والوں کی بھی ہیں۔ اُوپر کا اثر و رسوخ بھی چلتا ہے۔

ان عناصر نے مل جل کر پولیس کا وہ رول ہی بدل ڈالا ہے جو انگریزوں کے دَورِ حکومت میں ہُوا کرتا تھا۔ انگریز قانون کا احترام کرتے اور جرائم کے انسداد کو مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ علاقوں کے ڈی۔ ایس۔ پی تھانیداروں پر آسیب کی طرح سوار رہتے تھے۔ تھانوں پر اچانک چھاپے مارتے اور زیرِ تفتیش کیسوں کو دیکھتے اور تاخیر پر جواب طلبی کرتے تھے۔

اس صورتِ حال میں تھانیدار وارداتوں کی تفتیش اس طرح جانفشانی سے کرتے تھے جیسے زمین کی تہوں میں اُتر گئے ہوں۔ انہیں سراغرسانی کے کمالات دکھانے پڑتے تھے۔ وہ اینٹوں اور پتھروں کو بھی اُٹھا اُٹھا کر دیکھتے تھے کہ ان کے نیچے سے شاید کوئی سراغ مل جائے۔ محترم احمد یار خان کی تفتیشی کہانیاں اُسی دَور کی سچی کہانیاں ہیں۔ یہ کوئی عجیب و غریب قصے نہیں۔ اُس دَور میں تفتیش ہوتی ہی اسی طرح تھی۔ سنگین وارداتوں مثلاً قتل، ڈکیتی، نقب زنی کی سراغرسانی میں تھانیدار اِدھر اُدھر کے یا اُوپر کے اثر و رسوخ سے آزاد ہوتے تھے۔ پاکستان کی پولیس کا بھی یہی انداز ہونا چاہیے لیکن یہاں کی پولیس آزاد نہیں۔

پاکستان میں کسی کے گھر پُراسرار طور پر پتھر پڑنے اور کپڑوں کو آگ لگنے کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ انہیں جنوں بھوتوں کی کارستانی کہا جاتا ہے۔ یہ

دراصل ایک سنگین جرم ہے جو کالے علم کے ذریعے کیا جاتا ہے لیکن یہاں پولیس ایسی وارداتوں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ احمد یار خان کے اس مجموعے میں ایک کہانی ـــــ "دل دیوانہ پیار کے پتھر" ـــ شائع کی گئی ہے۔ یہ سچی کہانی ہماری پولیس کی آنکھیں تو نہیں کھول سکے گی، پڑھنے والوں کی آنکھیں کھل جائیں گی۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت"، لاہور

سات سانپوں کا زہر

فوجی جوان دس روز کی چھٹی آیا اور مارا گیا۔ آدھی رات کے لگ بھگ اُس کے گاؤں کا نمبردار تھانے میں رپورٹ دینے آیا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ ایک چوکیدار تھا اور دوسرا اسی گاؤں کا ایک آدمی جس نے لاش دیکھی تھی۔ ان کی رپورٹ کے مطابق یہ آدمی کہیں سے گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ چاندنی میں اسے دو کھیتوں کے درمیان پینڈھ پہ ایک آدمی پڑا نظر آیا۔ اس نے گھوڑی سے اُتر کر دیکھا۔ یہ آدمی مرا ہُوا تھا۔ اُس نے اسے پہچان لیا۔ یہ اُسی کے گاؤں کا ایک جوان آدمی تھا۔ اُس نے نمبردار کو جگا کر بتایا۔ نمبردار اور چوکیدار لاش دیکھنے گئے اور لاش دیکھنے والے کو ساتھ لے کر تھانے آ گئے۔

میں اپنی کئی کہانیوں میں بتا چکا ہوں کہ اُن دنوں اور اُن علاقوں میں قتل کی وارداتیں بہت ہی کم ہُوا کرتی تھیں۔ یہ حال نہیں تھا جو پاکستان میں ہے۔ دن دہاڑے قتل ہوتے ہیں۔ پورے پورے کُنبے قتل ہو جاتے ہیں۔ ان میں سیاسی قتل بھی شامل ہیں۔ تھانے میں قتل کی وارداتوں کی تفتیشوں کے انبار لگے رہتے ہیں اور کارگزاری ویسی ہی ہوتی ہے جیسے کلرک سرکاری

دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں قتل اور ڈکیتی کو اس قدر سنگین وارداتیں سمجھا جاتا تھا کہ پولیس کی مشینری طوفان کی طرح حرکت میں آجاتی تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی اور ایس۔ پی انگریز ہوتے تھے جو تھانیداروں پر آسیب کی طرح سوار رہتے تھے۔ بغیر اطلاع موقعۂ واردات پر پہنچ جاتے تھے۔ تفتیش کی روزمرّہ ڈائری ایس۔ ایچ۔ او ہیڈکوارٹر کو بھیجتے تھے جو بالائی افسر غور سے پڑھتے اور تفتیش کی نگرانی کرتے تھے۔

میرے تھانے کے ایک گاؤں کا نمبردار آدھی رات کے وقت قتل کی رپورٹ لایا تو مجھے یہ سوچنے تک کی جرأت نہ ہوئی کہ کچھ دیر اور سولوں اور نمبردار وغیرہ کو انتظار میں بٹھائے رکھوں۔ مرنے والا تو مر ہی چکا تھا مگر میں اُسی وقت تیار ہوا۔ گھوڑا تیار کرایا۔ اے۔ ایس۔ آئی، ہیڈ کانسٹیبل اور چار کانسٹیبلوں کو ساتھ چلنے کے لئے تیار کیا اور دفتر میں ایف۔ آئی۔ آر لکھنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اس کے لئے ضروری معلومات لیں اور میں اپنے عملے کے ساتھ چل پڑا۔ فاصلہ دو میل سے کچھ کم ہی تھا۔

راستے میں نمبردار، چوکیدار اور لاش دیکھنے والے آدمی سے اپنی تفتیش کے لئے معلومات لیتا گیا۔ ان کے مطابق مقتول کے متعلق پتہ چلا کہ ایک سال گزرا فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ ٹریننگ ختم کر کے دس روز کی چھٹی آیا تھا۔ یہ چھٹی ہر رنگروٹ کو ٹریننگ کے بعد ملا کرتی تھی۔ عمر اکیس بائیس سال تھی۔ اُس وقت دوسری جنگِ عظیم تیسرے سال میں داخل ہو چکی تھی۔ ہندوستان خطرے میں تھا۔ جاپانی فوجیں برما پر قابض ہو چکی تھیں۔ ہندوستان میں

فوجی بھرتی کا یہ عالم تھا کہ جو جوان چلنے کے قابل ہوتا اُسے بھرتی کر لیا جاتا تھا۔ انگریزوں نے بھرتی کے لئے اتنی کشش پیدا کر دی تھی کہ لڑکے گھروں سے بھاگ بھاگ کر بھرتی ہو جاتے تھے۔ مقتول کھاتے پیتے زمیندار کا بیٹا تھا جس کے لئے فوجی نوکری میں کوئی مالی کشش نہیں تھی۔ باپ کی اراضی بہت تھی لیکن وہ بھرتی ہو کر چلا گیا اور اب سپاہی بن کر ٹریننگ کے بعد کی چھٹی لے کر آیا تھا۔

اُس کی شادی بھرتی ہونے سے چھ مہینے پہلے ہو گئی تھی۔ اُس کی ماں کبھی کی مر چکی تھی۔ اُس کے بھرتی ہونے سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ دوسری بیوی اٹھارہ انیس سال عمر کی نوجوان لڑکی تھی۔ مقتول کے باپ کی عمر پچاس ساٹھ سال کے درمیان تھی۔ مقتول کا کوئی اور بھائی نہیں تھا۔ دو بہنیں تھیں۔ ایک کی عمر چھ سات سال اور دوسری کی دس گیارہ سال تھی۔

سوتیلی ماں کا نام سُن کر میرا دماغ روشن ہو گیا۔ سوتیلی ماں کا ایک پہلو تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کی پہلی بیوی کی اولاد کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی۔ اس کا دوسرا پہلو بھی ہے جو حادثوں کا باعث بنتا ہے۔ یہ ایک تکون ہے جس کے تین زاویے ہوتے ہیں —— ایک بوڑھا آدمی، دوسرے اس کی نوجوان دوسری بیوی اور تیسرے گھر میں ایک جوان بیٹا —— یہ تکون مکمل ہو جائے تو اس کے اندر قتل کی واردات ہو سکتی ہے اور اکثر ہو جاتی ہے۔ شہریوں کا رویّہ کچھ اور ہوتا ہے۔ دیہاتی چونکہ انتہا پسند ہوتے ہیں اس لئے

نوبت قتل تک پہنچ جاتی ہے۔ اس واردات میں بھی (اگر یہ قتل کی ہی واردات تھی) مجھے ایسا ہی شک ہُوا۔

اس پہلو کا بھی ایک پہلو تھا۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے مقتول کا اپنی نوجوان سوتیلی ماں کے ساتھ درپردہ دوستانہ نہ پیدا ہُوا ہو، بلکہ مقتول نے دوستانہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ سوتیلی ماں نے مقتول کے باپ کو بتا دیا ہو گا اور باپ نے بیٹے کو قتل کرا دیا ہو گا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ باپ نے اپنی دوسری بیوی کو اپنے جوان بیٹے میں قابلِ اعتراض دلچسپی لیتے دیکھ لیا ہو اور اُس نے بیٹے کو خُفیہ طریقے سے قتل کرا دیا ہو۔ یہ میری قیاس آرائیاں تھیں، البتہ اس حد تک میرے ذہن نے قبول کر لیا کہ قاتل مقتول کے گھر میں ہے۔

اس گھر میں ایک لڑکی اور بھی تھی۔ یہ مقتول کی بیوی تھی جو مقتول کی سوتیلی ماں کی ہم عمر تھی۔ وہ بھی اس واردات میں ملوث ہو سکتی تھی۔ میں نے نمبردار سے دو اِن لڑکیوں کے متعلق پوچھا کہ کیسی ہیں۔ اُس نے بتایا کہ مقتول کی سوتیلی ماں شریف لڑکی ہے۔ اس میں لڑکیوں والی شوخی بھی نہیں۔ مقتول کی بیوی تیز طرار اور شوخ ہے۔ اس لحاظ سے سارے گاؤں کی لڑکیاں اور عورتیں اسے پسند کرتی ہیں۔ ان کے گھر میں لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ یہ ان دونوں لڑکیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ مقتول کی بیوی کا نام اتفاق سے مجھے یاد رہ گیا ہے۔ نام اُرملا تھا۔ یہ لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ چند دن رہتی اور اپنے میکے چلی جاتی تھی۔ چند دن وہاں رہتی اور آ جاتی تھی۔ مقتول بھرتی ہو کر چلا گیا تو اُرملا یہ تمام عرصہ اپنے ماں باپ کے گھر رہی۔

"اب آ گئی ہو گی" ـــ میں نے کہا ـــ "اس کا خاوند چھٹی آ گیا تھا۔"

"نہیں آئی" ـــ نمبردار نے بتایا ـــ "مقتول کو آئے چار پانچ روز گزر گئے تھے۔ اس کی بیوی نہیں آئی۔"

"مقتول اُسے لینے گیا ہو گا؟"

"معلوم نہیں" ـــ نمبردار نے جواب دیا۔

"مقتول کیسا آدمی تھا؟"

"عام سی شکل والا جوان تھا" ـــ نمبردار نے جواب دیا ـــ "جسم بھی ایسا نہیں تھا جیسے دیہاتی جوانوں کے ہوتے ہیں۔ چونکہ خوشحال زمیندار کا بیٹا تھا اس لئے سب اس کی عزت کرتے تھے۔ چال چلن کا بُرا نہیں تھا۔"

"کسی کی بہو بیٹی کے ساتھ مراسم ہوں گے؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "یا کسی سے چھیڑ چھاڑ کی ہو گی؟"

"ایسی کوئی بات سُنی نہیں" ـــ نمبردار نے کہا اور چوکیدار نے اور ان کے ساتھ آئے ہوئے آدمی نے نمبردار کی تائید کی۔

دیہات میں کسی کی کوئی ایسی ویسی حرکت چھُپ نہیں سکتی۔ دیہاتیوں کو ایک دوسرے کے گھروں کی اُن باتوں کا بھی علم ہوتا ہے جو وہ ایک دوسرے سے چھپانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ اگر مقتول میں کوئی بُرائی ہوتی تو نمبردار اور چوکیدار اس سے ناواقف نہیں ہو سکتے تھے۔ مقتول کی بیوی اس کے ہاں نہیں آئی تھی، حالانکہ وہ ایک سال بعد چھٹی آیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان میں ناچاقی تھی۔

ساس بھی جوان، بہو بھی جوان

گاؤں سے لالٹینیں آگئی تھیں۔ لاش کو دیکھنے سے پہلے مجھے اپنا یہ نقصان نظر آیا کہ لاش کے اردگرد کوئی کُھرا سلامت نہیں تھا۔ پہلے نمبردار، چوکیدار اور لاش کو سب سے پہلے دیکھنے والا آدمی لاش کے اردگرد گھومتے پھرتے رہے تھے۔ نمبردار لاش پر جن دو آدمیوں کو پہرے پر چھوڑ آیا تھا، انہوں نے بھی قاتل کے کُھرے مسل ڈالے تھے۔ ان کے علاوہ وہاں چند اور آدمی آ گئے تھے۔ ان میں مقتول کا باپ بھی تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ میں نے لاش کو غور سے دیکھا۔ لاش پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ آنکھیں کھلی ہوئی اور مُنہ بند تھا۔ چہرے پر درد یا موت کی تلخی کا تاثر تھا۔ لاش کا رنگ نیلا ہو گیا تھا۔ ناک میں خون جما ہُوا نظر آ رہا تھا اور ہونٹوں کے کونوں میں بھی تھوڑا سا خون تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے یہ خون اندر سے نکلا ہو۔ بعض اوقات ناک اور مُنہ سے ذرا سا خون سر پر شدید ضرب لگنے سے بھی نکلتا ہے۔ میں نے سر کو غور سے ہر طرف سے دیکھا۔ ضرب کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ پھر کپڑے ہٹا ہٹا کر سارے جسم کا معائنہ کیا۔ کہیں بھی زخم یا چوٹ کا نشان نہیں تھا۔ کپڑوں پر خون کا ہلکا سا بھی داغ دھبہ نہیں تھا۔ گردن کو دو لالٹینوں کی روشنی میں بڑی ہی غور سے دیکھا۔ وہاں رسّی سے یا ہاتھوں سے گلا گھونٹنے کا کوئی نشان نہیں تھا۔

میری نظر ڈاکٹر کی نظر نہیں تھی۔ میں اپنے تجربے کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے سانپ یا کسی بڑے ہی زہریلے بچھو نے ڈسا ہو۔ میں نے سانپ کے ڈنک کے مرے ہُوئے آدمی دیکھے تھے۔ کچھ دیر بعد ان کی لاشوں کی حالت ایسی ہی ہو گئی تھی۔ اس علاقے میں ایک بڑا ہی زہریلا بچھو ہُوا کرتا تھا۔ اس کے ڈسے ہُوئے انسان یا جانور کا یہی حال ہو جاتا تھا۔ میں نے لاش کے پاؤں اور پنڈلیاں دیکھیں۔ سانپ اور بچھو کے ڈنک کا نشان یہیں ہو سکتا تھا۔ لاش کے پاؤں میں چپل تھے۔ ایڑیاں اور پنجے ننگے تھے۔ میں نے چپل اُتار کر دونوں پاؤں دیکھے۔ وہاں بھی کوئی نشان نہیں تھا۔ سانپ کے کاٹنے کے نشان بڑے صاف ہوتے ہیں۔

اس کے بعد موت کا باعث زہر خورانی رہ جاتا تھا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ سوال یہ تھا کہ یہ یہاں کیوں آیا؟ کیا یہ کسی کے گھر سے آ رہا تھا جہاں اسے زہر دیا گیا تھا اور یہاں آ کر گر پڑا؟ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے اپنے باپ نے یا سوتیلی ماں نے زہر دیا ہو اور یہ کہیں جا رہا ہو مگر زہر کے اثر نے اسے آگے نہ جانے دیا۔ یہ واردات خودکشی کی بھی ہو سکتی تھی۔ اس نے زہر خود کھا لیا ہو گا اور گھر سے نکل آیا ہو گا۔ خودکشی کی صورت میں بھی مجھے تفتیش کرنی تھی۔

میں نے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوایا اور مقتول کے گاؤں جا کر چوپال میں ڈیرے ڈال دیئے۔ نیند اُڑ گئی تھی۔ نہ اُڑتی تو بھی سونے کا سوال ختم ہو گیا تھا۔ مجھے تفتیش کرنی تھی۔ میرے بچنے کی یہی ایک صورت تھی کہ ڈاکٹر لکھ دے کہ مرنے والے کو سانپ نے کاٹا ہے۔ میں نے مقتول کے باپ کو کمرے میں بٹھایا۔ اس

کاروناقدرتی تھا۔ اس کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان تھی۔ قدبُت اچھا تھا۔ اس نے سر کے بالوں اور مونچھوں کو خضاب سے سیاہ کر رکھا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں جنہیں اس نے تاؤ دے رکھا تھا۔ وہ گردن کو اکڑا کر اور لمبا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ غالباً خضاب اور مصنوعی حرکتوں سے مجھ پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ ابھی جوان ہے اور اس نے نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کرکے غلطی نہیں کی۔

میں نے اُس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہے؟ اُس نے زور دے کر کہا کہ اُس کا سلوک ہر کسی کے ساتھ بڑا اچھا ہے اور کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔

"کیا تم دل سے چاہتے ہو کہ تمہارے بیٹے کے قاتل کو پکڑ کر اُسے سزا دلائی جائے؟"

"کیوں نہیں چاہتا؟" — اُس نے جواب دیا — "مجھے پتہ چل جائے کہ قاتل کون ہے تو اُسے اپنے ہاتھوں گولی مار دوں گا۔"

"پھر میں جو پوچھوں وہ بالکل صحیح بتانا" — میں نے کہا اور اُس سے پوچھا — "تمہارا بیٹا جب بھرتی ہو کر چلا گیا تو تمہاری بیوی خوش ہوئی تھی یا اُسے افسوس ہُوا تھا؟ .... جواب دینے سے پہلے یہ سوچ لو کہ میں صرف تمہارا بیان نہیں لوں گا۔ تمہاری بیوی ہے، بچیاں ہیں اور گاؤں کے اتنے زیادہ لوگ ہیں جو تمہارے گھر کی ہر ایک بات جانتے ہیں۔ مجھے ان سب کے بیان لینے ہیں۔"

اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا — "راجپوت کا بچہ ہوں۔ جھوٹ

نہیں بولوں گا" — اُس نے میرے سوال کا یہ جواب دیا — "میں نے یہ نہیں دیکھا کہ میرا بیٹا جب فوج میں گیا تو میری بیوی خوش تھی یا اُداس۔"

"ٹریننگ کے دوران تمہارا بیٹا تمہیں خط لکھتا رہا ہے؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "اُس نے ایک بھی خط نہیں لکھا۔"

"تم نے لکھا ہوگا؟"

"دو تین لکھے تھے" — اس نے جواب دیا — "مگر اس نے جواب نہیں دیا۔"

"کوئی ناراضگی تھی؟"

"ناراضگی تو کوئی نہیں تھی۔"

"تمہاری بیوی نے کبھی تم سے پوچھا تھا کہ بیٹے کا خط نہیں آیا؟" — میں نے کہا — "وہ آخر ماں تھی، خواہ سوتیلی ہی تھی۔ تمہیں خوش کرنے کے لئے ہی کبھی اس نے پوچھا ہوگا۔"

وہ ذرا طیش میں آگیا۔ بولا — "آپ کا مطلب کیا ہے؟ آپ مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

میں تفتیش کے دوران دل اور دماغ کو ٹھنڈا رکھا کرتا تھا۔ غصّہ کام بگاڑ دیا کرتا ہے۔ اس آدمی کو دیکھ کر ہی مجھے غصّہ آگیا تھا۔ وہ اس عمر میں جوان بننے کی کوشش کر رہا تھا اور نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کرکے یہ توقع لگائے بیٹھا تھا کہ اُس کی ناک پر مکھی نہ بیٹھے۔ اُس نے طیش میں بات کی تو میرا غصّہ بھڑک اُٹھا لیکن میں نے غصّے پر قابو پا لیا۔

"راجپوت مہاراج!" میں نے ذرا مُسکرا کر کہا — "میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمہاری دوسری بیوی جس کی عمر تمہارے بیٹے سے دو سال کم تھی، اس بیٹے کے ساتھ خوش رہتی تھی یا اس لڑکی کا اُس کے ساتھ سلوک کیسا تھا۔ سوتیلی ماؤں کا سلوک اچھا نہیں ہُوا کرتا۔"

وہ جھکا اور بے چین سا ہو کر بولا — "سلوک اچھا ہی تھا۔"

"تمہارے بیٹے کی بیوی کے ساتھ اس کا سلوک کیسا تھا؟"

"ان میں کھٹ پٹ لگی رہتی تھی" — اُس نے جواب دیا — "میری بہو جھگڑالو سی ہے اور میری بیوی ایسی چالاک اور تیز طرار نہیں۔"

"تمہاری بہو کا تمہارے بیٹے کے ساتھ سلوک کیسا تھا؟"

"میرا خیال ہے اچھا نہیں تھا۔"

"ان میں کبھی لڑائی جھگڑا ہُوا تھا؟"

"میرے سامنے کبھی نہیں ہُوا تھا" — اُس نے جواب دیا — "میں زیادہ وقت باہر کھیتوں میں گزارتا تھا۔"

باپ بیٹے کا دشمن تھا؟

میں اس سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی بیوی کا اس کے بیٹے کے ساتھ درپردہ تعلق تو نہیں تھا یا کیا ان دونوں کے درمیان ناراضگی تھی۔ یہ شخص یا تو بہت چالاک تھا کہ پردہ ڈالنے میں کامیاب رہا یا میری سوچ

غلط تھی اور وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس کے مُنہ سے میں وہ بات نہ نکلوا سکا جو میں نکلوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یہ توقع رکھنی بھی نہیں چاہیئے تھی کہ وہ اپنی عزت پر اپنی زبان سے کیچڑ اُچھالے گا۔ ایسی معلومات دوسرے ذرائع سے ہی مل سکتی تھیں۔ اس سے میں نے یہ حاصل کیا کہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور بدلتے رنگوں کو دیکھتا رہا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے کچھ باتیں چھپالی ہیں اور میرے سوالوں کے اس نے جو جواب دیئے ہیں، ان میں جھوٹ کی ملاوٹ ہے، اور مجھ پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ باپ بیٹے میں ناراضگی تھی۔ میں نے اس سے کچھ اور پوچھنا شروع کر دیا۔

"تمہارا بیٹا کس وقت گھر سے نکلا تھا؟"

"میں نے نہیں دیکھا" — اُس نے جواب دیا۔

"تم نے اُسے کس وقت گھر میں دیکھا تھا؟"

"سورج غروب ہونے سے پہلے میں نے اسے اپنے کمرے میں جاتے دیکھا تھا" — اُس نے بتایا — "یہ نہیں دیکھا کہ باہر کس وقت نکلا۔"

"گھر میں لڑائی جھگڑا ہُوا تھا؟"

"بالکل نہیں۔"

"اس نے گھر کھانا کھایا تھا؟"

"مجھے معلوم نہیں" — اُس نے جواب دیا — "وہ الگ کھانا کھاتا تھا۔"

"وہ سورج غروب ہونے سے پہلے گھر سے نکلا" — میں نے پوچھا — "گھر واپس آیا ہو گا۔"

"میں نے نہیں دیکھا۔"

"تم نے اُسے اس لئے نہیں دیکھا کہ تم اس کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے" ۔۔۔ میں نے طنزیہ کہا ۔۔۔ "جو باپ جوان بیٹے کی موجودگی میں اُس کی عمر کی لڑکی کے ساتھ شادی کر لیتے ہیں وہ اپنے بیٹے کے اسی طرح دشمن ہو جاتے ہیں جس طرح تم اپنے بیٹے کے ہو گئے تھے۔"

میں نے یہ بات اُس کا ردِّعمل دیکھنے کے لئے کہی تھی۔ اپنے ردِّعمل پر قابو پانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ انسان جو بات زبان سے نہیں کہتا، وہ اُس کا ردِّعمل بتا دیا کرتا ہے بشرطیکہ تفتیشی افسر کی نظر گہری ہو۔ میرے طعنے پر اس آدمی کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ غصے کے آثار بھی پیدا ہوئے مگر اُس نے دبی دبی زبان میں کہا ۔۔۔ "میری اپنے بیٹے کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

میں نے ہوا میں تیر چلایا

صبح طلوع ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ باہر کانسٹیبلوں کے پاس بیٹھ جائے، گھر نہ جائے۔ اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ اسے جانے نہ دے۔ نمبردار سے کہا کہ اس کی بیوی کو بلا لائے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک لڑکی چہرہ گھونگھٹ میں چھپائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے نمبردار کو باہر نکال کر لڑکی کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور اسے کہا کہ وہ گھونگھٹ اُٹھا دے۔ گھونگھٹ سے جو چہرہ برآمد ہوا اس میں کوئی غیر معمولی کشش نہیں تھی۔ وہ نوجوان اور قبول صورت

لڑکی تھی، بدصورت نہیں تھی۔ میں نے بات کرنے سے پہلے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ شکل و صورت سے وہ روایتی ہندو لڑکی لگتی تھی جس میں شرم و حجاب تھا۔

"کیا تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ تمہارا سوتیلا بیٹا مر گیا ہے؟"

"ہاں!" ۔۔۔ اُس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

"یہ بھی پتہ چلا ہے کہ کس طرح مرا ہے؟"

"کہتے ہیں قتل ہو گیا ہے" ۔۔۔ اس نے جواب دیا ۔۔۔ "عورتوں سے سُنا ہے کہ اسے کسی نے زہر دیا ہے۔"

"خاوند نے کچھ نہیں بتایا؟"

"وہ تو رات کو اطلاع ملتے ہی نکل گئے تھے پھر واپس نہیں آئے۔"

"اُس کا کوئی دشمن تھا؟"

"میں کیا جانوں" ۔۔۔ اُس نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا ۔۔۔ "باہر کسی کے ساتھ دشمنی ہو گی۔"

"اُس نے خود زہر کھا لیا ہو گا؟"

اس نے گردن کو ذرا سا خم دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اُسے معلوم نہیں۔

"سُنا ہے تمہارے ساتھ دل کی باتیں کیا کرتا تھا" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "اُس کے ساتھ تمہارا سلوک سوتیلی ماؤں والا نہیں تھا اور تمہیں وہ اچھا لگتا تھا۔"

"میرے ساتھ اُس نے کبھی کوئی بات نہیں کی" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "وہ تو مجھ سے ناراض رہتا تھا۔"

"ناراضگی کی وجہ؟"

اس نے سسکی لینے کے انداز سے کہا — "وہی جانے"۔

"وہ باپ سے بھی ناراض رہتا تھا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟"

"ہاں" — اس نے دھیمی سی آواز میں جواب دیا — "ناراض ہی رہتا تھا"۔

"اس نے کل شام کھانا گھر ہی کھایا تھا؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "وہ کھانے کے وقت سے پہلے گھر سے نکل گیا تھا"۔

"وہ جب واپس آیا تو تم نے اُسے گلاس میں دُودھ پلایا تھا" — میں نے ہوا میں تیر چلایا۔ اُس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ میں نے کہا — "اُس نے دُودھ خود مانگا تھا یا تم نے خود ہی دیا تھا؟"

"وہ شام سے پہلے کا نکلا ہُوا واپس ہی نہیں آیا تھا" — اُس نے پہلی بار جاندار آواز میں بات کی — "اُس نے نہ کبھی مجھ سے دُودھ مانگا تھا نہ میں نے اُسے کبھی دُودھ دیا تھا"۔

سوتیلی ماں پر دست درازی

اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے لیکن مجھے یقین کرنا تھا۔ میں نے اسے دُودھ کے گلاس پر ہی چکمہ دینے شروع کر دیئے۔ وہ جان گئی کہ میں اُس پر یہ شک کر رہا ہوں کہ اُس نے مقتول کو زہر دیا ہے۔ میں نے اُسے اتنے چکمہ

دیئے کہ وہ تنگ آ گئی۔ یہاں تک کہ اُس کے آنسو نکل آتے۔ پہلے وہ ادھورے ادھورے جواب دیتی یا چُپ رہتی تھی، میں نے اسے پریشان کر دیا تو وہ جوشیلی آواز میں تفصیل اور وضاحت سے جواب دینے لگی۔

"اگر مجھے یہ بتا دو وہ تم سے اور اپنے باپ سے کیوں ناراض رہتا تھا تو میں تمہیں سچا سمجھ کر ابھی چھُٹی دے دوں گا"۔

اُس نے سر جھکا لیا۔ چند سیکنڈ خاموش رہی۔ سر اُٹھایا۔ میرے مُنہ کی طرف دیکھا اور بولی — "کچھ باتیں ایسی ہیں جو میرے مُنہ سے نہیں نکلنی چاہئیں۔ انہیں (خاوند) پتہ چل گیا تو ناراض ہوں گے"۔

"تم نہیں بتاؤ گی تو بھی یہ باتیں مجھ تک پہنچ جائیں گی" — میں نے کہا — "پھر میں تمہیں اپنے سوتیلے بیٹے کے قتل کے شک میں گرفتار کر لوں گا"۔ اُس کا جسم کانپا اور اُس کا رنگ جو صاف سُتھرا گندمی تھا پیلا پڑ گیا۔ میں نے کہا — "تم مجھے جو کچھ بھی بتاؤ گی وہ میں تمہارے خاوند کو نہیں بتاؤں گا۔ میرے ساتھ دل کھول کر بات کرو اور اپنی جان چھڑاؤ"۔

"وہ ٹھیک آدمی نہیں تھا" — اُس نے کہا — "اُس نے پہلے دن سے دل میں یہ خیال ڈال لیا تھا کہ چونکہ میں جوان ہوں اور اس کا باپ بوڑھا ہے اس لئے میں اس بوڑھے کو پسند نہیں کرتی اور اس سے خوش نہیں۔ اس کا باپ باہر نکل جاتا تو یہ (مقتول) میرے اردگرد اس طرح گھومنے لگتا جیسے میں اس کی دلہن ہوں۔ پہلے تو میں اس کی نیت نہ سمجھی۔ ایک روز اس کا باپ کسی دوسرے گاؤں کو چلا گیا۔ اسے رات وہیں رہنا تھا۔ اُس رات اُس کے بیٹے

کی نیت کھل کر سامنے آگئی۔ اس نے مجھ پر دست درازی کی۔ میں اسے کہتی رہی کہ میں اس کی ماں ہوں مگر وہ نہیں مان رہا تھا۔ اس نے زبردستی کی کوشش کی تو میں دوڑ کر صحن میں آگئی اور اسے کہا کہ میں شور مچا کر گاؤں کو جگا دوں گی۔ تب اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا کہ آئندہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ اس نے یہ منت بھی کی کہ میں اس کے باپ کو نہ بتاؤں.....

"میں نے اس کے باپ کو نہ بتایا۔ بہت دن گزر گئے تو میرے سوتیلے بیٹے نے پھر ویسی ہی حرکتیں شروع کر دیں۔ باپ گھر نہ ہوتا تو یہ رسوئی میں میرے پاس بیٹھ جاتا۔ بیہودہ چھیڑ چھاڑ کرتا اور اسی طرح مجھے تنگ کرتا رہا۔ میری برداشت ختم ہوگئی تو ایک روز میں نے اس کے باپ کو بتا دیا۔ باپ اسے اپنے ساتھ کھیتوں پر کام کے لئے لے گیا۔ بہت وقت بعد واپس آتے۔ اُس روز کے بعد باپ بیٹے میں بول چال بند ہوگئی۔ میں اس (مقتول) کے آگے کھانا رکھتی تھی اور وہ کھا لیتا تھا۔ زیادہ وقت باہر گزارتا تھا۔ کام کاج بھی اس نے کم کر دیا۔"

"کل ان کا آپس میں لڑائی جھگڑا ہوا تھا؟"

"گھر میں نہیں ہوا" — اُس نے جواب دیا — "باہر کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

"تم نے اتنی ساری باتیں بتا دی ہیں" — میں نے کہا — "ایک بات اور بتا دو.... تم اس بوڑھے کے ساتھ خوش ہو؟"

"ہاں خوش ہوں" — اُس نے شرمیلی آواز میں جواب دیا۔ ذرا سوچ کر بولی — "مجھے باپ بیٹے کی ناراضگی پسند نہیں تھی۔ میں نے اپنے خاوند سے کہا

کہ اپنے بیٹے کی شادی کر دو۔ وہ اتنے ناراض تھے کہ اپنے بیٹے کے بھلے بُرے کے ساتھ بھی انہوں نے تعلق توڑ لیا تھا۔ وہ نہیں مان رہے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ اس عمر میں دوسری بیوی لے آتے ہیں اور وہ جوانی میں اکیلا پھر رہا ہے، اس کی شادی ہو جاتے تو خوش رہے گا اور مجھ سے اس کی نظر ہٹ جاتے گی۔ اُس کے باپ نے کہہ کہلوا کر ایک رشتہ ڈھونڈ لیا اور اس کی شادی ہوگئی۔"

"سنا ہے اس لڑکی کے ساتھ تمہاری نہیں بنتی تھی؟" — میں نے پوچھا — "کیا وجہ تھی؟"

"میں سوتیلی ماں ہوں نا!" — اُس نے جواب دیا — "سارے پاپ میرے ہی ہوں گے۔ یہ لڑکی (اُرملا) گھر بیٹھنے والی لڑکی نہیں تھی۔ ہنستی کھیلتی زیادہ تھی۔ میرے خاوند نے اسے اتنا زیادہ باہر رہنے سے منع کیا تو اُسے شک ہوا کہ میں نے اپنے خاوند کو اُس کے خلاف بھڑکایا ہے۔ میں خود اُس کی شوخیاں اور بے حیائی پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے خاوند کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ جب جی میں آتی میکے چلی جاتی۔ اب دیکھئے خاوند کو آئے چوتھا پانچواں دن ہے وہ میکے سے نہیں آئی۔"

"اُس کا خاوند اُسے لینے گیا تھا؟"

"نہیں گیا" — اس نے جواب دیا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ نے حیران کر دیا

اس پر میں نے کئی گھنٹے جرح کی۔ بہت کچھ پوچھا۔ وہ مجھے بے گناہ نظر

آتی تھی۔ مقتول کی بیوی کے خلاف اُس نے بہت باتیں کہیں۔ میں اُس کی ہر بات کو صحیح نہیں مان سکتا تھا۔ میرے لئے اُرملا (مقتول کی بیوی) خاص اہمیت رکھتی تھی۔ اُس کا گاؤں وہاں سے ڈیڑھ میل دُور تھا۔ دن کے بارہ بج چکے تھے۔ میرے لئے کھانا آگیا۔ مقتول کی سوتیلی ماں کو میں نے گھر بھیج دیا لیکن اُس کے خاوند کو نہ جانے دیا۔ اس کی بیوی میرے اس شک کی تائید کر گئی تھی کہ اس شخص نے مجھ سے بہت سی باتیں چھپالی ہیں۔ اس سے مجھے شک ہونے لگا کہ اس نے اپنے بیٹے کو خود زہر دیا ہے۔ اس شک کے ساتھ ہی یہ شک بھی پیدا ہُوا کہ مقتول کی سوتیلی ماں نے بھی مجھ سے کچھ چھپا لیا ہے۔

میرے خیال میں اُس نے چھپایا یہ تھا کہ مقتول چھٹی آیا تو وہ اپنی بیوی کو لینے نہ گیا کیونکہ (اس کی سوتیلی ماں کے بیان کے مطابق) بیوی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ وہ شاید بیوی کو گھر لانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ان چند دنوں کے دوران مقتول نے اپنی ہم عمر سوتیلی ماں پر ایک بار پھر دست درازی کی ہو گی۔ اس لڑکی نے مقتول کے باپ کو بتایا ہو گا اور باپ نے بیٹے کو زہر دے دیا ہو گا۔

یہیں سے ایک اور شک پیدا ہُوا۔ مقتول کی بیوی اپنے خاوند کے گھر نہیں ٹھہرتی تھی۔ وہ اب چھٹی آیا تو بھی اس کے پاس نہ آئی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں خاوند کی محبت ہے نہ کوئی قدر۔ ہو سکتا ہے وہ سُسرال گیا ہو اور اس لڑکی نے ہی اسے زہر دے یا دلوا دیا ہو۔ اس صورت میں ایک بات قابلِ غور تھی۔ ہندو عورت خواہ شادی کے پہلے روز ہی بیوہ ہو جاتے اُسے دوسری شادی کی اجازت نہیں تھی۔ اس کی قسمت میں ساری عمر کی بیوگی

لکھ دی جاتی تھی۔ اُرملا نے اگر اپنے خاوند کو زہر دیا تھا تو اُس نے کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کا پروگرام بھی بنا رکھا ہو گا۔ اپنے خاوند کو قتل کر کے وہ تمام عمر کی بیوگی قبول نہیں کر سکتی تھی۔

"کیا اُرملا ابھی تک اپنے گھر ہو گی؟" — اس سوال نے مجھے پریشان کر دیا۔ اب تک وہ بھاگ گئی ہو گی۔

میں نے اُس کے گاؤں جا کر تفتیش کرنا بہتر سمجھا۔ روانہ ہونے ہی لگا تھا کہ ایک کانسٹیبل پوسٹ مارٹم رپورٹ لے کر آگیا۔ میں نے بیتابی سے رپورٹ پڑھی۔ امید تھی کہ لکھا ہو گا کہ مرنے والا سانپ کے ڈسنے سے مرا ہے مگر رپورٹ نے مجھے چکرا دیا۔ لکھا تھا کہ زہر مُنہ کے راستے نہیں دیا گیا یعنی کسی کھانے پینے والی چیز میں ملا کر نہیں دیا گیا بلکہ زہر خون میں شامل کیا گیا ہے — انجکشن کے ذریعے۔

یعنی خون میں INJECT کیا گیا ہے۔ لکھا تھا کہ بائیں بازو میں سرنج کی سوئی داخل ہونے کا نشان ہے اور اس جگہ سوزش کا نشان ہے۔ جگر اور گُردہ کھاتے جا چکے ہیں۔ بازو کے نشان کے علاوہ جسم پر چوٹ یا زخم کا کوئی نشان نہیں ہے۔

دھوکے میں کسی کو زہر کا انجکشن دے دینا کوئی حیران کر دینے والی واردات نہیں لیکن دیہاتی علاقے میں کسی کو اس سائنسی طریقے سے مارنا میرے لئے حیران کن تھا۔ اُس دَور میں مریضوں کے علاج میں انجکشن بہت کم استعمال ہوتے تھے۔ آج کل تو یہ حال ہے کہ انجکشن کے بغیر مریض مطمئن نہیں ہوتا۔

آج کل لوگ اپنے آپ کو خود بھی انجکشن لگا لیتے ہیں۔ نشئی لوگ سرینج اپنے پاس رکھتے اور اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ بھینس دُودھ نہ دے اور قابو میں نہ آتے تو گوالے اسے نشہ آور دوائی کا انجکشن دیتے ہیں۔ میں تو کہوں گا کہ یہ دَور ہی انجکشنوں کا ہے۔

اُس وقت جس وقت کی میں کہانی سُنا رہا ہوں انجکشن ہسپتالوں میں لگتے تھے۔ اتنے دُور دراز دیہات میں انجکشن کی سرینج نہیں پہنچی تھی۔ مقتول کے گاؤں کے ارد گرد ہسپتال تو دُور کی بات ہے کوئی ڈسپنسری بھی نہیں تھی۔ چھ میل دُور قصبے میں سرکاری ہسپتال تھا۔ ہو سکتا تھا کہ مقتول کسی بیماری کے علاج کے لئے وہاں گیا ہو اور کمپاؤنڈر نے غلطی سے کسی زہریلی دوائی کا انجکشن دے دیا ہو۔ یہ ہسپتال سے معلوم کیا جا سکتا تھا کہ مقتول وہاں گیا تھا یا نہیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ کسی دشمن نے اسے زہر کا انجکشن دے دیا ہو۔

تتلیوں کی طرح اُڑنے والی بیوی

مَیں نے لاش کے ساتھ جو سوال بھیجے تھے ان میں ایک تو یہ تھا کہ مقتول کس وقت مرا، اور ایک سوال یہ بھی کہ اسے زہر موت سے کتنی دیر پہلے دیا گیا۔ پہلے سوال کا جواب تو مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ مل گیا۔ موت آدھی رات سے بہت پہلے واقع ہوئی تھی۔ اس سوال کا جواب اس ہسپتال سے نہیں مل سکتا تھا کہ زہر موت سے کتنی دیر پہلے دیا گیا۔ اس کا جواب ایک سَو میل دُور

لیبارٹری سے مل سکتا تھا۔ ہسپتال کے ڈاکٹر نے مقتول کے جگر اور گُردوں کے ٹکڑے ماہرین کے معائنے کے لئے وہاں بھیج دیتے تھے۔ اُس وقت میرا خیال یہ تھا کہ زہر کھانے میں دیا گیا ہے۔ انجکشن کے ذریعے دیا ہُوا زہر جگر اور گُردوں کو تباہ کرتا ہے اور دل پہ بھی اثر انداز ہوتا ہے اس لئے ماہرین کے لئے جگر اور گُردوں کے ٹکڑے بھیجے گئے تھے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہو سکتا تھا کہ زہر کونسا ہے۔

میرے لئے بہت بڑی مشکل پیدا ہو گئی۔ اس پسماندہ علاقے میں زہر کے انجکشن نے پیچیدگی پیدا کر دی۔ میں نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو اپنی کارگزاری اور پوسٹ مارٹم رپورٹ لکھ کر بھیج دی۔ یہ تو دستور کے مطابق بھیجنی ہی تھی لیکن مجھے توقع تھی کہ انگریز افسر بھی زہر کے انجکشن پر چونک اُٹھیں گے اور میری مدد کو آئیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ دیہاتی تھانوں کے لئے واردات کا یہ طریقہ انوکھا ہے۔

مقتول کے گاؤں میں اب یہ صورتِ حال تھی کہ لاش آ گئی تھی۔ گاؤں ماتم کر رہا تھا۔ لاش کو جلانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میرے مُخبر جاسوسی میں مصروف تھے۔ مجھے اپنی ایک حماقت کا احساس ہُوا۔ میں اُرملا کے گاؤں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ مجھے اچانک خیال آ گیا کہ وہ مقتول کی بیوی ہے۔ وہ اپنے سُسرال آ گئی ہو گی۔ میں نے نمبر دار سے کہا کہ وہ اُرملا کو بُلا لائے۔ وہ گیا اور واپس آ کر بتایا کہ اُرملا نہیں آئی۔ اُس کے ماں باپ آتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُرملا اپنے خاوند کو اس حد تک ناپسند کرتی تھی کہ اُس کے مرنے پر بھی نہ آئی۔ اس سے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ خاوند کو اسی نے قتل کیا یا کرایا ہو گا۔

میں اُس کے گاؤں چلا گیا اور نمبردار کے گھر جا ٹھہرا۔ وہاں قتل کی خبر پہنچ چکی تھی۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ وہ اُرملا کو بلا کر باہر بٹھا دے۔ دو کانسٹیبلوں کو اُن کے گھر کے اِردگرد پہرے کے لئے اس ہدایت کے ساتھ بھیج دیا کہ نہ کوئی اندر جائے نہ کوئی اندر سے باہر آئے۔ اُرملا کا گھر قریب ہی تھا۔ نمبردار اُسے لے آیا اور باہر بٹھا کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اُرملا کے متعلق مجھے تفصیل سے بتائے کہ کیسی لڑکی ہے۔

"اچھی شہرت کی لڑکی نہیں"۔۔۔ نمبردار نے کہا۔۔۔ "چُلبلی اور ہنسنے کھیلنے والی لڑکی ہے۔ اپنے خاوند کے ساتھ اِس کا سلوک اچھا نہیں تھا۔ میکے ہی بیٹھی رہتی تھی۔ یہاں زیادہ تر وقت کھیتوں میں بھاگتے دوڑتے یا یہ ساتھ جو ندی ہے، اس میں کُودتے پھلانگتے گزارتی ہے۔"

"مقتول کی سوتیلی ماں کیسی ہے؟"

"وہ سیدھی لڑکی ہے"۔۔۔ نمبردار نے جواب دیا۔۔۔ "ماں باپ نے اُس پر ظلم کیا ہے کہ اس کمسنی میں اتنی پُرانی عمر کے آدمی کے ساتھ بیاہ دیا ہے لیکن سب اس لڑکی کی تعریف کرتے ہیں۔ گاؤں میں کسی کی کوئی حرکت خواہ وہ زمین کے نیچے کرے چھُپ نہیں سکتی۔"

"مجھے شک ہے مقتول کے ساتھ اس کی درپردہ دوستی تھی"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "ورنہ یہ لڑکی بوڑھے کے گھر خوش نہ رہ سکتی۔"

"اجی وہ زنخا کسی کے ساتھ کیا دوستی لگاتے گا"۔۔۔ نمبردار نے حقارت کے لہجے میں کہا

"کون زنخا؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"یہی جو مارا گیا ہے"۔۔۔ نمبردار نے کہا۔۔۔ "مرد ہوتا تو اُس کی بیوی یوں تتلیوں کی طرح اُڑتی پھرتی؟ لڑکی ہر جگہ کہتی پھرتی ہے کہ میں اس شخص کے مُنہ پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ آپ ہی بتائیے داروغہ حضور! کسی مرد کی بیوی ایسا لفظ مُنہ سے نکالے تو اُس کی لاش گاؤں میں نہ پڑی ہو؟"

"مقتول کا باپ کیسا آدمی ہے؟"

"بُرا آدمی نہیں"۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ "چھوٹی چھوٹی بچیوں کی خاطر اس نے دوسری شادی کی ہے۔"

"اگر اُرملا کو خاوند سے اتنی نفرت تھی تو اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہو سکتی کہ خاوند کی عادتیں مردوں جیسی نہیں تھیں"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "وہ ضرور کسی کو چاہتی ہو گی۔"

"یہ بات بھی ہے"۔۔۔ نمبردار نے جواب دیا اور میں نے دیکھا کہ وہ جھجک گیا۔ فدویانہ لہجے میں بولا۔۔۔ "آپ بُرا نہ مان جائیں۔ آپ مسلمان ہیں اور میں مسلمانوں کی بات کروں گا۔"

"مجھے قاتل کو پکڑنا ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اگر مشتبہوں میں میرے باپ کا نام آتا ہے تو اُس کا بھی نام لو۔ مجھ سے کچھ چھپانا نہیں ورنہ اس کا نتیجہ تم جانتے ہو۔"

عباس اور اُرملا

اس گاؤں سے ایک میل سے کچھ کم فاصلے پر بیس بائیس گھروں کا ایک

گاؤں تھا۔ یہ سارے گھرانے مسلمانوں کے تھے۔ اُرملا کے گاؤں اور مقتول کے گاؤں میں ایک بھی گھر مسلمانوں کا نہیں تھا۔ اُرملا کے گاؤں اور مسلمانوں کے گاؤں کے درمیان وہ ندی بہتی تھی جس میں اُرملا کودنے پھلانگنے اور نہانے جایا کرتی تھی۔ وہ علاقہ پوری طرح میدانی نہیں تھا۔ ندی نیچے تھی اور چٹانوں میں سے بل کھاتی گزرتی تھی۔ اوٹ بہت تھی۔ نمبردار نے مجھے بتایا کہ یہ ایک رواج بن گیا ہے کہ مسلمانوں کے گاؤں کے جوان لونڈے ہماری لڑکیوں پر نظر رکھتے ہیں اور یہ کہانی بڑی عام ہو گئی ہے کہ اِدھر اُدھر کے ہندو گاؤں میں سے کوئی لڑکی کسی مسلمان کے ساتھ لگ گئی ہے۔ ایسی لڑکیوں کی فوراً شادی کر دی جاتی ہے لیکن میری یاد میں مختلف گاؤں کی چار ہندو لڑکیاں مسلمانوں کے پیچھے گھروں سے نکل گئیں اور مسلمان ہو کر شادیاں کر لی ہیں۔

"اُرملا کے متعلق بھی یہی رپورٹ ملی ہے"۔۔۔ نمبردار نے کہا۔۔۔"شادی سے بہت پہلے مسلمانوں کے گاؤں کے ایک عباس نام کے جوان آدمی سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ اسے ماں باپ نے مارا پیٹا۔ باہر جانے سے روکا۔ میں نے اسے دھمکیاں دیں لیکن لڑکی اتنی دلیر ہے کہ باز نہ آئی۔ ایک رات جب اس کے گھر والے سوتے ہوئے تھے وہ نکل گئی اور بہت دیر سے واپس آئی۔ باپ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اُس نے لڑکی کو بہت پیٹا۔ اُس روز سے وہ رات کو باہر والے دروازے کو اندر سے تالا لگا کر سونے لگا۔ ایک رات اُرملا دیوار پھلانگ کر نکل گئی۔ ہم نے اس کا یہی علاج سوچا کہ اس کی شادی کر دی جائے ورنہ یہ مسلمانوں کے پاس بھاگ جائے گی۔۔۔

"مقتول کے لئے رشتہ درکار تھا۔ ہم نے فوراً اس لڑکی کا رشتہ دے کر شادی کا دن مقرر کر دیا۔ شادی سے تین روز پہلے لڑکی غائب ہو گئی۔ واپس نہ آئی تو میں دو پنچوں کو ساتھ لے کر مسلمانوں کے گاؤں گیا۔ ہم جانتے تھے کہ لڑکی اسی گاؤں میں ہو گی۔ وہاں کے پنچوں سے ہم نے منّت سماجت کی کہ لڑکی برآمد کر دیں کیونکہ ہماری عزّت کا سوال ہے۔ انہوں نے عباس کے باپ سے بات کی۔ باپ نے عباس کو بُرا بھلا کہا اور ایک جھونپڑے سے لڑکی برآمد ہو گئی۔ وہ شام کو نکلی تھی اور اگلے روز دوپہر کو جب ہمیں واپس ملی تو یہاں آ کر اُس نے شادی سے صاف انکار کر دیا۔ بہت دلیر لڑکی ہے۔ ہم نے اس کی شادی زبردستی کی مگر شادی سے ہمارا منشا پورا نہ ہُوا۔ خاوند ایسا نکلا جو اسے لگام نہ دے سکا۔ لڑکی تیسرے چوتھے روز یہاں آ جاتی۔ ہر روز ندی کی طرف نکل جاتی۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں بتاتیں کہ وہ چٹانوں میں غائب ہو جاتی ہے۔ ہم مجبور ہو گئے۔ پھر مقتول فوج میں بھرتی ہو کر چلا گیا۔ یہ لڑکی بالکل ہی آزاد ہو گئی۔ ہم نے اس کے سُسر کو جا کر شرم دلائی لیکن وہ ہم سے بھی زیادہ مجبور تھا۔ کہتا تھا کہ یہاں آتی ہے تو میری بیوی سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ شخص اپنی نئی بیوی کے ساتھ مگن تھا۔"

"عباس کیسا آدمی ہے؟"

"خوشحال زمیندار کا بیٹا ہے"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔"خوبصورت جوان ہے۔ جسم طاقت والا ہے۔"

مسلمانوں کے اس چھوٹے سے گاؤں کے متعلق ہمیں قارئین کی دلچسپی

کے لئے کچھ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ یُوں سمجھ لیں کہ اس کفرستان میں یہ ننھا سا ایک پاکستان تھا۔ وہ علاقہ ہندوؤں کی غالب اکثریت کا تھا جہاں مسلمانوں کی حیثیت کیڑوں مکوڑوں جیسی تھی۔ زراعت اور تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی مگر میرے تھانے کی حدود میں مسلمانوں کا یہ گاؤں اپنی مثال آپ تھا۔ آباؤ اجداد سے ان کی جو اراضی ورثے میں آئی تھی وہ خاصی زیادہ تھی اور زرخیز بھی۔ ان لوگوں میں اتحاد تھا اور انہیں احساس تھا کہ وہ ہندوؤں کے درمیان اقلیت میں ہیں۔ اگر وہ متحد اور خوشحال نہ رہے تو ہندو انہیں کھا جائیں گے۔ ان کے پاس روپیہ پیسہ بھی تھا۔ ان کے قد بُت بڑے اچھے، شکل وصورت کے لحاظ سے بھی اچھے اور صاف سُتھرے رہنے والے لوگ تھے۔ ان میں دلیری بھی تھی لیکن وہ دلیری کے مظاہرے آپس میں لڑ کر نہیں کرتے تھے بلکہ ہندوؤں کے سر پر سوار رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جو ہندو لڑکیاں مسلمان لڑکوں سے وابستہ ہو جاتی تھیں، اُن کے باپ اور گاؤں کے دیگر مرد ان مسلمانوں کے مُنہ آنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

جب وہ میرے سامنے آتی

نمبردار کو باہر بھیج کر میں نے اُرملا کو اندر بلایا۔ اچھے پُرکشش جسم کی لڑکی تھی۔ چہرہ بھی کشش والا تھا۔ رنگ سپیدی مائل گندمی تھا۔ کچھ تو میں اس کے متعلق بہت کچھ سُن چکا تھا اور کچھ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ لڑکی کھلاڑی ہے۔

چہرے پر خوف اور گھبراہٹ قدرتی تھی جو میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے دُور کر دی۔ اس لڑکی کو بہت زیادہ مغموم ہونا چاہیئے تھا لیکن اس کے چہرے پر ہلکی سی اُداسی بھی نہیں تھی۔ اسے ساری عمر بیوہ رہنا تھا۔ عورت کے معاملے میں ہندو بڑی ہی ظالم قوم ہے۔ وہ تو بیوہ ہو جانے والی عورت کو اُس کے خاوند کے ساتھ زندہ جلا دیا کرتے تھے۔ مُغلیہ دورِ حکومت آیا تو یہ رسم جسے ستی کہتے تھے مسلمانوں نے حکماً بند کر دی۔ ہندوؤں نے اپنی عورتوں پر اس سے زیادہ ظلم کیا۔ بیوہ خواہ نوجوان ہی ہو دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ زندہ جلانے کی بجائے انہیں ساری عمر اپنے جذبات کی آگ میں جلتے رہنے کے لئے زندہ رہنے کا حق دے دیا۔

میں نے اُرملا سے افسوس کا اظہار کیا کہ وہ اسی عمر میں بیوہ ہو گئی ہے۔ اُس کا ردِ عمل بالکل سرد تھا۔ میں نے بے تکلفی کی باتیں قدرے مزاحیہ انداز میں کیں تو وہ پوری طرح بے تکلف ہو گئی۔

"تمہیں افسوس نہیں کہ تمہیں ساری عمر بیوہ رہنا پڑے گا؟"

"یہ افسوس ضرور ہے لیکن خاوند کے مرنے کا کوئی زیادہ افسوس نہیں" ——— اُس نے جواب دیا۔

میں اُس کے انداز اور چہرے کے تاثرات میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اُس میں قتل کرنے یا کرانے کی اہلیت ہے یا نہیں۔

"وہ کس طرح قتل ہُوا ہے؟" ——— اُرملا نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ معلوم ہوتا تو تمہارے پاس کیوں آتا" ——— میں نے کہا ——— "قاتل کون

ہو سکتا ہے؟"

"میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔"

"اُس کی سوتیلی ماں چالباز نظر آتی ہے"۔۔۔ میں نے اُس کا رویّہ معلوم کرنے کے لئے کہا ۔۔۔ "اُسے معلوم تھا کہ یہ شخص زندہ رہا تو جائیداد کا وارث ہوگا۔ وہ اپنی اولاد کو وارث بنانے کی فکر میں تھی۔ سُنا ہے تمہارے ساتھ لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ میرا خیال ہے وہ تمہیں اپنے گھر سے بھگانا چاہتی تھی۔"

"آپ کو یہ شک ہے کہ میرے خاوند کو اُس کی سوتیلی ماں نے قتل کرایا ہے؟"۔۔۔ اُس نے پوچھا۔

"شک نہیں"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "مجھے یقین ہے۔"

"اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں گی کہ مجھے اُس پہ ذرا سا بھی شک نہیں"۔۔۔ اُرملا نے کہا ۔۔۔ "اُس بے چاری میں اتنی جرأت کہاں؟ کسی کو قتل کرنا یا کرانا کوئی معمولی سی بات ہے؟ مسلمانوں اور سکھوں کے متعلق سُنا ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں پر قتل کر دیتے ہیں۔ ہمارے مرد تو مکھی اور مچھر کو بھی نہیں مارتے۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ اس لڑکی نے ایک آدمی کو قتل کرایا ہوگا؟"

میں اس کے جواب سے مایوس بھی ہُوا حیران بھی۔ مجھے توقع تھی کہ وہ مقتول کی سوتیلی ماں کے خلاف میرے شک کو پختہ کرے گی تاکہ میں اُس پر شک نہ کروں لیکن وہ اُسے بے گناہ ثابت کر رہی تھی۔ میں نے سوتیلی ماں کے خلاف من گھڑت باتیں شروع کر دیں۔ اُرملا نے کسی ایک بات کی بھی تائید نہیں کی بلکہ بعض باتوں کی تردید بھی کی۔

"تم اتنی بُدھو لڑکی ہو کہ تمہیں یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ تمہارے خاوند کے اور اپنی سوتیلی ماں کے در پردہ تعلّقات تھے"۔۔۔ میں نے اُسے گرمانے کے لئے کہا ۔۔۔ "تم نے آ کر اپنے خاوند پہ قبضہ کر لیا۔"

"آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "اُس کی اور میرے خاوند کی بول چال ہی بند تھی۔ میرا اور اس لڑکی کا جو لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا وہ میں کیا کرتی تھی۔ اس بُدھو لڑکی کو تو میں نے دبا لیا تھا۔ میں اُسے تنگ کئے رکھتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ میری ہم عمر ہے، میرے ساتھ ہنسے کھیلے اور خاوند کی غلام نہ بنی رہے۔ وہ مجھے ہنسنے کھیلنے اور بلا وجہ باہر نکلنے سے روکتی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ میرا اس گھر میں دل لگتا ہی نہیں تھا۔ میں تو چاہتی ہی یہی تھی کہ میرا خاوند اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ دل لگا لے اور مجھ سے دُور رہے لیکن اُسے کوئی لڑکی دل لگانے کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ وہ خود اپنے آپ کو بڑا خوبصورت جوان سمجھتا تھا۔"

لڑکی بدکی اور تڑپی

"تم نے اُسے دل لگانے کے قابل کیوں نہ سمجھا؟"

"آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ کچھ وجوہات ایسی ہوتی ہیں جو عورت کے دل میں کسی مرد کے خلاف نفرت پیدا کر دیتی ہیں"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "لیکن اس شخص میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت بات یہ تھی کہ اپنے آپ کو مہاراجہ اندر

سمجھتا تھا۔ شادی کے پہلے روز مجھے کہنے لگا کہ آج دس بارہ لڑکیوں کے دل ٹوٹ گئے ہیں۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ اتنی ساری لڑکیاں اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھیں۔ میں جب اس کے گھر بیاہی ہوئی گئی تو اس کی ماں ہم عمری کی وجہ سے میری سہیلی بن گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے خاوند نے اُس پر دست درازی کی تھی اور اُسے کہتا رہتا تھا کہ اُس کا خاوند بوڑھا ہے اور وہ خود خوبصورت جوان ہے۔ اس لڑکی نے اُس کے باپ کو بتا دیا۔ باپ بیٹے میں سخت ناراضگی پیدا ہو گئی۔ باپ نے اپنی بیوی کے زور دینے پر بیٹے کی شادی کی کوشش شروع کر دی۔ میرا باپ میرا رشتہ دینے پر راضی ہو گیا۔ میرا سُسر کہتا تھا کہ شادی جلدی ہونی چاہیئے لیکن ہماری طرف سے دیر ہو گئی۔"

"دیر کی کیا وجہ تھی؟"

"میرے باپ کے پاس پیسے کم تھے۔"

"اور دوسری وجہ یہ تھی کہ تم نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔"

"نہیں تو" — اُس نے قدرے بوکھلا کر کہا — "میں نے انکار نہیں کیا تھا۔"

"اور تم شادی سے دو تین روز پہلے گھر سے ہی غائب ہو گئی تھیں" — میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ اُس کی شوخی اور بے تکلفی ختم ہو گئی۔ میں نے اُسے کہا — "حیران نہ ہو اُرملا! ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اگر تم عباس کو اتنا زیادہ چاہتی ہو تو یہ کوئی جرم نہیں۔ میں تمہیں گرفتار تو نہیں کر لوں گا" — اُس کے دل پر قبضہ کرنے کے لئے کہا — "مجھے تو خوشی ہے کہ تم ایک مسلمان کو

چاہتی ہو۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ تمہاری مدد کروں گا" — میں اُسے اپنے مطلب کے لئے جھانسہ دے رہا تھا۔ میرے فرائض ایسے تھے کہ ہندو مسلمان میری نظر میں ایک تھے۔ ایک آدمی قتل ہو گیا تھا۔ مجھے قاتل کو پکڑنا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا — "کیا تم مسلمان ہو کر عباس کے ساتھ شادی کر لو گی؟ کیا وہ تمہارے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہے؟ ساری عمر کی بیوگی سے بچنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ تم نے شاید سوچا بھی یہی تھا۔"

اُس کی زبان ہکلانے لگی۔ وہ دراصل دیہات کی اُن شوخ اور چنچل لڑکیوں میں سے تھی جن کی زبان اُن کے قابو میں نہیں ہوتی۔ اُرملا کو میں نے بولنے اور بولتے رہنے کا موقعہ اور حوصلہ دیا تو اُس کی زبان بے لگام ہو گئی۔ جہاں میں نے اُسے ایک ضرب لگا دی، اُس کی زبان ہکلا گئی اور دماغ سوچنے کے قابل نہ رہا۔ کئی بار پوچھنے کے باوجود کہ وہ گھر سے بھاگ کر عباس کے پاس چلی جاتی تھی، اُس نے کوئی ایسا جواب نہ دیا جسے میں اعتراف سمجھتا۔ کبھی کہتی — "عباس کا میرے خاوند کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا" — کبھی کہتی — "آپ کوئی اور بات پوچھیں" — ایک دو بار اُس نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔

مجھے شک ہونے لگا کہ اپنے خاوند کے قتل کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔ شک تو مجھے پہلے ہی تھا لیکن اُس کی باتوں سے شک رفع ہوتا جا رہا تھا۔ اب عباس کے ذکر سے اُس کا جو حال ہونے لگا اس سے میرا شک عود کر آیا اور شک پختہ ہونے لگا۔ میں نے سوچا کہ اسے جذبات کے جال میں لایا جائے

"سنو اُرملا!" ـــ میں نے پولیس کی مخصوص چالاکی اور اُستادی کو بروئے کار لاتے ہوئے کہا ـــ "میں نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ تمہاری اور عباس کی مدد کروں گا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے دل میں عباس کی کتنی محبت ہے۔ جھوٹ نہ بولنا اُرملا! مجھے ہر ایک بات کا پتہ ہے۔ کہو تو تمہیں تمہاری اور عباس کی چار ملاقاتوں کا پورا حال سُنا دوں۔ بولو.... ندی والی چٹانوں کے اندر کی باتیں سُنا دوں؟ .... میں تمہارا امتحان لینے کے لئے پوچھ رہا ہوں کہ تمہارے دل میں عباس کی کتنی محبت ہے۔"

"آپ میری محبت کا حساب نہیں لگا سکتے" ـــ اُس نے سر جُھکا کر دھیمی آواز میں جواب دیا اور مجھ سے پوچھا ـــ "آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اُرملا!" ـــ میں نے اپنے لب و لہجے میں فلمی ہیرو والی مصنوعی جذباتیت پیدا کر کے کہا ـــ "میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ میں نے بھی محبت کی ہے۔ وہ لڑکی بالکل تم جیسی تھی۔ وہ بھی یہی کہا کرتی تھی کہ ہماری محبت کا کوئی حساب نہیں لگا سکتا۔ خدا نے اُس سے محبت کی اتنی بڑی قربانی مانگی جو مرد بھی دینے سے گھبراتے ہیں، لیکن اُس نے یہ قربانی دی۔ یہ قربانی جان کی تھی" ـــ مجھے اب اپنے سارے مکالمے یاد نہیں رہے۔ میں نے جذباتی ایکٹنگ سے اُسے متاثر کر لیا اور پوچھا ـــ "کیا تم برداشت کر لو گی کہ عباس پھانسی چڑھ جائے؟"

"پھانسی اُس کے دشمن چڑھیں" ـــ اُس نے کہا ـــ "اُسے آپ کس جُرم میں پھانسی چڑھائیں گے؟"

"وہ تمہارے خاوند کا قاتل ہے" ـــ میں نے آگے ہو کر دھیمی سی آواز میں کہا ـــ "اور تم اچھی طرح جانتی ہو۔"

وہ جس طرح بدکی اور جس طرح تڑپی، میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ کبھی میرے مُنہ کی طرف دیکھتی کبھی اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔ اُس کے ہونٹ کانپتے مگر زبان سے کوئی لفظ نہ نکلتا۔ میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے آنسو بہنے لگے۔ میں باہر نکل گیا۔ ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ مسلمانوں کے گاؤں جائے اور عباس نام کے آدمی کو یہاں لے آئے۔ میں کمرے میں چلا گیا۔

تیسری عورت

"کیا آپ اسی لئے مجھ سے یہ باتیں پوچھتے رہے تھے؟" ـــ اُرملا نے روتے ہوئے کہا ـــ "میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ ہر بات سچ بتائی۔ آپ نے جو نہیں پوچھی وہ بھی بتا دی۔ اگر عباس قاتل ہوتا تو میں یہ نہ کہہ دیتی کہ نہیں عباس کو میں نہیں جانتی کہ وہ کون ہے؟ میں یہ بھی کہہ دیتی کہ مجھے اپنا خاوند بڑا اچھا لگتا تھا۔"

میں نے اُس کی سُنائی ہوئی باتوں کے مطابق اُس پہ جرح شروع کر دی۔ وہ بلا جھجک جواب دیتی چلی گئی۔ اُس نے کئی بار کہا ـــ "مجھے اپنے خاوند سے نفرت تھی اور میں عباس کو چاہتی تھی" ـــ اور اُس نے یہ بھی

کہا ــــ "خاوند کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اُس نے مجھے عباس سے ملنے سے روک تو نہیں لیا تھا۔ وہ کوئی دیوار تو نہیں تھا۔ مجھے ایک نہ ایک دن گھر سے بھاگنا تھا، مسلمان ہونا تھا اور عباس کے ساتھ شادی کرنی تھی۔ اگر یہ جُرم ہے تو مجھے گرفتار کر لو۔ راجپوت کی بیٹی ہوں اور مسلمان کی بیوی بن کے رہوں گی۔"

لڑکی میری توقع سے زیادہ تیز اور ہوشیار تھی۔ میں اُس کے اِن الفاظ سے متاثر نہ ہُوا کہ وہ مسلمان کی بیوی بن کے رہے گی۔ اُس نے یہ الفاظ شاید مجھے خوش کرنے اور مجھے اپنا ہمدرد بنانے کے لئے کہے تھے۔ اب چونکہ اُس کی زبان پھر رواں ہو گئی تھی، اس لئے میں نے اُسے لقمے دینے شروع کر دیئے۔ اس قسم کے مشتبہ کو بولنے سے روکنا نہیں چاہیئے۔ زبان بے لگام ہوتی ہے تو کئی پردے اُٹھا دیتی ہے۔ اُرملا کا بولنا اب پہلے بولنے سے مختلف تھا۔ اب اُس کے جذبات بھڑکے ہوئے تھے اور وہ عباس کو قتل کے الزام سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُسے شاید توقع تھی کہ زیادہ سے زیادہ بولنے سے اور جو مُنہ میں آتے وہ کہتے چلے جانے سے عباس بچ جائے گا۔

میری حوصلہ افزائی اور لقموں اور سوالوں سے بات پھر مقتول پر آ گئی۔

"دیکھئے، میں جھوٹ نہیں بول رہی" ــ اُس نے کہا ــ "میں نے اپنے خاوند سے صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے تم سے نفرت ہے جو کبھی بھی محبت میں

نہیں بدل سکے گی۔ وہ آخر مرد تھا۔ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ میرا تعلق عباس کے ساتھ ہے۔ اُس نے کہا کہ میں جانتا ہوں تم نے کس کے ساتھ یاری لگا رکھی ہے۔ میں نے کہا کہ اتنے جوان مرد اور دلیر ہو تو جاؤ اُس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لو نا۔ مجھ پر ہاتھ اُٹھا کر دیکھو۔ آپ نہیں جانتے کہ وہ کتنا گھٹیا آدمی تھا۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں تم سے زیادہ خوبصورت لڑکی کے ساتھ دوستی لگا کر دکھاؤں گا۔ مجھے معلوم نہیں کہ باہر وہ کیا کرتا تھا۔ میرے ساتھ وہ لڑکیوں کی باتیں کرتا رہتا تھا....

"میں نے اُسے کہا کہ تمہارے ساتھ کوئی بدصورت لڑکی بھی بات کرنا پسند نہ کرے۔ اُس نے کہا کہ کل دیکھ لینا۔ دوسرے دن وہ اپنے ساتھ ایک جوان عورت کو لے آیا۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ میرا خاوند اس کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرتا اور مجھے مسکرا مسکرا کر دیکھتا رہا۔ یہ عورت اُس سے تین چار سال بڑی ہے۔ وہ اُس کے گاؤں کی رہنے والی ہے۔"

"تمہیں غصّہ آیا ہو گا؟" ــ میں نے کہا۔

"میں نے اس عورت سے بھید لے لیا تھا" ــ اُس نے کہا ــ "وہ مجھے جانتی تھی میں اُسے جانتی تھی۔ وہ بیوہ ہے۔ تین سال ہوئے اُس کا خاوند مر گیا ہے۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق اُسے صاف کہا کہ سُنا ہے میرے خاوند کے ساتھ تمہاری بڑی گہری دوستی ہے۔ اُسے غصّہ آ گیا۔ میں نے کہا کہ تم اس کے ساتھ کیوں آتی ہو۔ اُس نے جواب دیا کہ تمہارا خاوند میرے بھائی کا دوست

ہے۔ یہ میرے بھائی کے پاس ہمارے گھر آتا رہتا ہے اور یہ میرے ساتھ ایسی باتیں کرتا ہے جن سے مجھے ایک دو بار شک ہوا کہ اس کی نیت ٹھیک نہیں۔ اس عورت نے مجھے کچھ باتیں سنائیں۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ تم اس کے ساتھ کیوں آگئیں؟ اُس نے کہا کہ یہ مجھے کہتا تھا کہ میری بیوی کے پاس چلو، وہ تمہیں بہت پسند کرتی ہے .... اس عورت کا باپ مر چکا ہے۔ اس کی ماں اندھی ہو چکی ہے۔ گھر میں اور کوئی نہیں۔ یہ گھر میں اکیلی ہوتی ہے اور میرا خاوند اس کے گھر جاتا رہتا ہے۔"

زہریلے انجکشن کا بھید

یہاں اُرملا نے ایک ایسی بات کہی کہ میں چونک اُٹھا ــــ "اس عورت کا بھائی میرے خاوند کا دوست تھا۔ وہ ہسپتال میں ملازم ہے۔ صبح سویرے سائیکل پر چلا جاتا ہے اور شام کو آتا ہے۔ پیچھے گھر میں کوئی مرد نہیں رہتا۔"

اس کے بعد میں نے نہیں سنا کہ اُرملا کیا کچھ کہتی رہی۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ چھ میل دُور ایک سرکاری ہسپتال تھا۔ مقتول کا یہ دوست اس ہسپتال میں ملازم تھا۔ میرے دماغ میں زہر کا انجکشن آگیا۔ اب اُرملا نے سنایا کہ اُس کا خاوند اس آدمی کی بہن پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ مجھے یوں تسکین محسوس ہونے لگی جیسے زہر انجیکٹ کرنے کا معمہ حل ہو گیا ہو۔ بہن نے اپنے

بھائی کو بتا دیا ہوگا کہ مقتول اسے پریشان کرتا رہتا ہے۔ بھائی نے مقتول کو زہر کا انجکشن دے کر ٹھکانے لگا دیا۔ یہ سوال ابھی جواب طلب تھا کہ مقتول کھیتوں میں کیسے جا گرا۔ شاید اس آدمی نے اسے اپنے گھر ختم کیا اور رات کو لاش کھیتوں میں جا پھینکی۔

میں باہر نکلا۔ عباس آگیا تھا۔ وہ خوبرو جوان تھا۔ ہندوؤں میں کھڑا صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ جوان کسی الگ تھلگ قوم کا جوان ہے جو ہندو قوم سے برتر اور اعلیٰ ہے لیکن مجھے جب یہ خیال آیا کہ یہی قاتل نکلا تو بڑا قیمتی جوان پھانسی چڑھ جائے گا، مجھے بہت دُکھ ہوا۔ انسان جوانی کے جذبات سے ایسا اندھا ہوتا ہے کہ نتائج کو بھول جاتا ہے۔ میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ایک قاتل کی ضرورت تھی اور یہ میرے فرض کا تقاضا تھا۔ مجھے اُمید کی ایک کرن نظر آگئی تھی۔ میں اس کی روشنی میں ہاتھ پاؤں مارنے جا رہا تھا۔ میں نے اپنے سٹاف سے کہا کہ مقتول کے باپ، سوتیلی ماں، عباس، اُرملا اور دونوں گاؤں کے نمبرداروں کو تھانے لے چلو۔

میں گھوڑے پر سوار ہوا اور اکیلا چھ میل دُور سول ہسپتال کو روانہ ہو گیا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی خاصا وقت تھا۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ میری کوشش اور دُعا یہ تھی کہ میں ہسپتال اُس وقت سے پہلے پہنچ جاؤں جس وقت اُس عورت کا بھائی وہاں سے چھٹی کرتا ہے جس کے پیچھے مقتول پڑا رہتا تھا۔

گھوڑے نے مجھے بروقت پہنچا دیا۔ ڈاکٹر مل گیا۔ اسی ڈاکٹر نے مقتول

کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ وہ مجھے جانتا پہچانتا تھا۔ اُس نے پوسٹمارٹم کی باتیں شروع کر دیں۔ اُس نے بتایا کہ لاش کے جگر، گُردوں اور دل کے ٹکڑے لیبارٹری میں ماہرین کے معائنے کے لئے بھیج دیتے گئے ہیں۔ وہاں سے پتہ چل جائے گا کہ زہر کونسا تھا اور موت سے کتنی دیر پہلے دیا گیا تھا۔ اُس نے بھی میری طرح حیرت کا اظہار کیا کہ ایسے پسماندہ دیہات میں بھی ڈاکٹری طریقے سے قتل ہونے لگے ہیں۔

"مجھے یقین ہے کہ انجکشن والی سرینج استعمال کی گئی ہے" — ڈاکٹر نے کہا — "لیکن گاؤں میں سرینج کس کے پاس ہو سکتی ہے؟"

"سرینج آپ کے ہسپتال سے گئی ہے" — میں نے کہا۔

"کون لے گیا تھا؟"

"یہی معلوم کرنے آیا ہوں" — میں نے کہا اور ہسپتال کے اس ملازم کا نام لے کر کہا — "مجھے اس پر شک ہے۔"

میں نے ڈاکٹر کو اپنے شک کی وجہ تفصیل سے بتا دی اور اُس سے پوچھا کہ یہ آدمی کیسا ہے اور یہاں کیا کرتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ ہسپتال میں دو کمپاؤنڈر ہیں۔ ایک سرجری (زخموں وغیرہ) کے لئے اور ایک دوائیاں (مکسچر وغیرہ) بنانے کے لئے، اور یہ ملازم اِن دونوں کی مدد کے لئے دونوں کے ساتھ کام کرتا ہے۔ مریضوں کے وارڈ میں بھی کبھی کبھی اس کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ چونکہ وہ کمپاؤنڈر نہیں تھا اس لئے ڈاکٹر اس کے متعلق زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اُس نے ایک کمپاؤنڈر کو بلایا اور مجھے کہا کہ میں اس سے جو کچھ پوچھنا

چاہوں پوچھ لوں۔ ڈاکٹر نے یہ بھی بتایا کہ مقتول کی لاش کے پوسٹمارٹم میں یہی کمپاؤنڈر مدد کے لئے ساتھ تھا۔

"یہ ملازم انجکشن بھی لگایا کرتا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"لگا سکتا ہے" — کمپاؤنڈر نے جواب دیا — "کبھی مریضوں کا رش ہو جاتے اور ہمیں فرصت نہ ہو تو یہ انجکشن لگا دیتا ہے۔"

یہ پیشِ نظر رکھیں کہ اُس دور میں ہسپتال میں اور پرائیویٹ ڈاکٹروں کے ہاں مریضوں کا آج والا رش نہیں ہوتا تھا۔ ہسپتالوں میں وارڈ خالی پڑے رہتے تھے۔ لوگوں کو خالص غذا ملتی تھی اس لئے تندرست رہتے تھے۔ دوائیوں کی کمی بھی تھی۔ آج کل کی طرح اتنی زیادہ دوائیاں نہیں تھیں۔ مکسچر چلتے تھے۔ انجکشن کسی کسی مریض کو لگتا تھا۔ یہ خیال عام تھا کہ انجکشن صرف اُس مریض کو لگایا جاتا ہے جس کے بچنے کی اُمید بہت کم رہ جاتی ہے۔

"تم نے مقتول کی لاش بڑی اچھی طرح دیکھی تھی" — میں نے کمپاؤنڈر سے کہا — "ایک دو روز پہلے یہ آدمی ہسپتال میں آیا تھا؟"

"یہ تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں" — ڈاکٹر نے کہا اور مجھ سے مقتول کا نام پوچھ کر اپنا رجسٹر دیکھنے لگا۔ ہر مریض کا نام رجسٹر میں درج ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نے چار پانچ دنوں کے نام دیکھ لئے۔ مقتول کا نام نہیں تھا۔

"پرسوں آیا تھا" — کمپاؤنڈر نے کہا اور ڈاکٹر سے کہنے لگا — "آپ کو یاد نہیں، پوسٹمارٹم کرتے وقت میں نے آپ سے کہا تھا کہ اس آدمی کو میں نے کل ہسپتال کے برآمدے میں کھڑے دیکھا تھا۔"

"دواتی لینے آیا تھا؟"

"آپ نے رجسٹر دیکھ لیا ہے" — کمپاؤنڈر نے جواب دیا — "اس کا نام رجسٹر میں نہیں تو یہ دواتی لینے نہیں آیا ہوگا۔ میں اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اپنے ملازم کو بُلایا۔ وہ برآمدے میں مقتول کے پاس کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ شاید اسی سے ملنے آیا تھا۔ دوسرے دن ملازم نے صبح مجھے بتایا کہ کل جو آدمی اُسے ملنے آیا تھا وہ قتل ہوگیا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ اُس کی لاش آچکی ہے اور میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ پوسٹمارٹم کے لئے جا رہا ہوں۔ میں واپس آیا تو اس نے مجھ سے پوسٹمارٹم رپورٹ کے متعلق پوچھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اُسے انجکشن کے ذریعے زہر دیا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ میرا دوست تھا۔"

سرنج گِر کر ٹُوٹ گئی

اس کمپاؤنڈر نے یہ ساری باتیں خود ہی نہیں بتاتی تھیں۔ میں اور ڈاکٹر اس سے جو کچھ پوچھتے رہے اس سے اُس کا یہ بیان بنا۔

"ذرا ذہن پر زور دو" — میں نے اسے کہا — "اور یاد کر کے بتاؤ کہ جس وقت تم نے اسے بتایا کہ مقتول کے جسم میں زہر انجیکٹ کیا گیا ہے اُس وقت اس نے کیا کہا یا کیا تھا اور اس کی حرکتوں کو تم نے غور سے دیکھا تھا؟"

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی اور کہا — "میں نے غور سے نہیں

دیکھا۔ اسے افسوس ضرور ہوا تھا۔"

"یہ یاد رکھو" — میں نے اسے کہا — "میں اور ڈاکٹر صاحب تم سے جو باتیں پوچھ رہے ہیں ان کا ذکر کسی اور سے نہ کرنا . . . . مجھے یہ بتاؤ کہ یہ آدمی کل پرسوں یہاں سے سرنج اپنے ساتھ گھر تو نہیں لے گیا تھا؟"

"مجھے بتا کر تو نہیں لے گیا" — اُس نے جواب دیا — "اگر چوری چھپے لے گیا ہو تو مجھے معلوم نہیں۔"

"آپ کے پاس سرنجیں زیادہ ہیں؟" — میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"انجکشن لگتے ہی کتنے ہیں" — ڈاکٹر نے جواب دیا اور کمپاؤنڈر سے پوچھا — "کیوں بھئی! تمہارے پاس ایک ہی سرنج ہو گی!"

"استعمال کے لئے ایک ہی رکھی ہوتی تھی" — کمپاؤنڈر نے جواب دیا — "آج وہ ٹوٹ گئی ہے۔ اسی ملازم کے ہاتھ سے گِر کر ٹوٹی ہے۔ ایک اور الماری میں رکھی تھی وہ نکال لی ہے۔"

میں اُچھل پڑا اور پوچھا — "اُس کے ہاتھ سے کس طرح ٹوٹی ہے؟ پوری بات سناؤ اور بتاؤ کہ کس وقت ٹوٹی ہے؟ اُس وقت تو نہیں ٹوٹی جب تم اُسے بتا چکے تھے کہ مقتول کو زہر انجکشن کے ذریعے دیا گیا ہے؟"

"جی ہاں!" — اُس نے جواب دیا — "میں اسے پوسٹمارٹم رپورٹ کے متعلق بتا کر ہاتھ دھو رہا تھا کہ مجھے فرش پر کچھ گرنے اور ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں سمجھا کوئی شیشی گر کر ٹوٹی ہے۔ دیکھا۔ یہ ملازم فرش پر پڑے ہوئے سرنج کے ٹکڑے پاؤں سے ایک طرف کر رہا تھا۔ میں نے اسے ڈانٹا کہ اُس

نے سرنج ٹرے سے اٹھائی ہی کیوں تھی۔ اُس لیے کہا کہ گرم پانی سے صاف کرنے لگا تھا، ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی۔ میں نے اسے کہا کہ یہ تو صبح سے اُبلتے ہوئے پانی میں پڑی رہی ہے۔ تمہارا اس سے کام ہی کیا تھا۔"

"اس سرنج سے کسی مریض کو انجکشن تو نہیں لگایا؟" — ڈاکٹر نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں جی!" — اس نے جواب دیا — "چار پانچ دن گزرے ایک مریض کو اس سے انجکشن لگایا تھا۔"

"میں اس ملازم کو تھانے لے جا رہا ہوں" — میں نے ڈاکٹر سے کہا۔

میں اُسے تھانے لے گیا۔

"مقتول کو انجکشن کس وقت دیا تھا؟" — اپنے دفتر میں بٹھا کر پہلا سوال کیا۔

وہ بہت گھبرایا۔ اس قدر زیادہ کہ اُس کے ہونٹ بڑی زور سے ہلے مگر اُس کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکلی۔

"غور سے سُن لو بھائی میرے!" — میں نے کہا — "حوصلہ قائم رکھو۔ مجھے لمبا چکر نہ دو۔ میں کوئی ضرورت نہیں سمجھتا کہ تم سے پوچھوں کہ مقتول تمہارے پاس ہسپتال کیوں آیا تھا اور تم نے سرنج اُس کے پوسٹ مارٹم کے بعد کیوں توڑی، پہلے ہی کیوں نہ توڑ دی۔ مجھے میرے سیدھے سے سوال کا سیدھا سا جواب دو۔ تم نے مقتول کو انجکشن لگایا تھا نا!"

اُس کا سر اقرار میں ہلا لیکن یہ جنبش بڑی ہی خفیف تھی۔

"شاباش!" — میں نے دوستانہ لہجے میں کہا — "تم نے میرا کام آسان کر دیا ہے۔ اب میں تمہاری مدد کروں گا۔ تمہیں سزائے موت نہیں ہونے دوں گا۔"

وہ کرسی سے اچھل کر اُٹھا اور میرے پاؤں میں بیٹھ کر میرے پاؤں پکڑ لیے۔ بلند آواز میں بولا — "ہاں حضور! اُسے انجکشن میں نے ہی لگایا تھا لیکن مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ دوائی کیا ہے۔"

"دوائی تم نہیں لاتے تھے؟" — میں نے کہا — "جھوٹ بولنے پر آ گئے ہو؟"

"دوائی وہ خود لایا تھا" — اُس نے جواب دیا۔

"تم دوائیوں کے نام نہیں پڑھ سکتے؟"

"اُس کے پاس چھوٹی سی ایک شیشی میں چند ایک قطرے دوائی تھی" — اُس نے جواب دیا — "شیشی پر کوئی لیبل نہیں تھا۔"

مجھے ایک خیال تو یہ آیا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ دوسرا خیال یہ بھی آیا کہ مقتول نے خودکشی تو نہیں کی؟ زہر لا کر اسے کہا ہو کہ دوائی ہے، اس کا انجکشن کر دو۔

"تم نے یہ تو پوچھا ہو گا کہ یہ کیسی دوائی ہے؟"

"پوچھا تھا حضور!"

"اُٹھو" — میں نے اُسے اُٹھا کر اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا اور کہا

ـــــ "ساری بات سنا دو، پھر میں اپنی بات کروں گا۔"

انسان کو جن بنانے والی دوائی

"وہ میرا دوست تھا" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "اپنے آپ کو جسمانی لحاظ سے وہ کمزور سمجھتا تھا۔ معلوم نہیں یہ وہم تھا یا وہ واقعی کمزور تھا۔ چہرے اور جسم سے کمزور ہی لگتا تھا۔ مجھ سے طاقت کی دوائیاں پوچھتا رہتا اور جوگیوں سنیاسیوں سے دوائیاں لیتا رہتا تھا۔ شادی کے بعد وہ پریشان رہنے لگا۔ دراصل اُس کی بیوی اچھی لڑکی نہیں۔ وہ مقتول کو پسند نہیں کرتی تھی۔ یہ بھرتی ہو کر چلا گیا۔ اب چھٹی آیا تو اس کی بیوی میکے سے نہ آئی۔ میں اسے کہتا رہا کہ وہ خود نہیں آتی تو تم جا کر لے آؤ۔ وہ نہیں جاتا تھا۔ تین چار روز چھٹی گزار کر ہسپتال میں میرے پاس آیا۔ مجھے چھوٹی سی ایک شیشی دکھا کر کہنے لگا ـــــ سنیاسیوں سے یہ دوائی لایا ہوں۔ کسی نے بتایا تھا کہ ان کے پاس ایسی ایسی جڑی بوٹیاں ہیں کہ انسان کو لوہا بنا دیتی ہیں۔ وہ کوئی ایک کوس دور ندی کے کنارے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ میں وہاں گیا۔ انہیں بتایا کہ میں بہت کمزور ہوں۔ ان کے بڑے سنیاسی نے مجھے کہا کہ عام لوگوں کے لئے سستی دوائیاں ہیں جو بہت دنوں بعد اثر کرتی ہیں۔ ایک دوائی ایسی ہے جو خون میں ملتے ہی اپنا ایسا اثر دکھاتی ہے کہ انسان جن بن جاتا ہے۔ اُس میں بھینسے اور گینڈے جیسی طاقت آجاتی ہے۔ وہ کھڑے درختوں کو

جڑوں سے اکھاڑ دیتا ہے لیکن یہ دوائی بہت مہنگی ہے۔ صرف راجے مہاراجے لیتے ہیں۔ کوئی عام آدمی خرید نہیں سکتا۔ اُس نے مجھے صرف ایک خوراک کی قیمت ایک سو روپیہ بتائی۔"

یہ خیال رکھیں کہ اُن دنوں کا ایک سو روپیہ آج کے ایک ہزار روپے کے برابر ہوا کرتا تھا۔ یہاں میں ایک اور بات بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اُس دَور اور آج کے دَور میں روپے پیسے کی قیمت میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ہے لیکن لوگوں کی عادتیں اور وہم نہیں بدلے۔ میں نے اُس وقت بھی دیکھا تھا کہ مردوں پر بڑھاپے میں بھی جوان بنے رہنے کا خبط سوار رہتا تھا اور جوان اس وہم میں مبتلا رہتے تھے کہ وہ کمزور ہیں۔ وہ حکیموں، جوگیوں اور سنیاسیوں سے دوائیاں لیتے رہتے تھے۔ آج میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ خبط بڑھ گیا ہے۔ جوگیوں اور سنیاسیوں کی دوائیوں کی جگہ انگریزی دوائیوں نے لے لی ہے۔ فلموں، ناولوں اور رسالوں نے جوانوں کو ذہنی عشق بازی کا عادی بنا دیا ہے۔ جوں جوں فلمیں، ناول اور رسالے وغیرہ پھیلتے جا رہے ہیں، طاقت کی دوائیوں کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔ اخلاقی پستی کے ساتھ ساتھ جسمانی کمزوری بڑھتی جا رہی ہے۔

مقتول کچھ تو جسمانی لحاظ سے دُبلا پتلا تھا، باقی کسر اُس کی بیوی نے آکر پوری کر دی۔ اُس نے عباس کو دل میں بٹھا رکھا تھا جو فی الواقع خوبصورت اور طاقتور جوان تھا۔ اُرملا عباس کی محبت کے زیرِ اثر مقتول سے نفرت کرتی اور اُسے طعنے دیتی تھی۔ اُرملا کا دل جیتنے کے لئے اُس نے درختوں کو

جڑوں سے اُکھاڑنے والا جوان بننے کی کوشش شروع کر دی۔ اس قسم کے جوان اشتہاری حکیموں اور سنیاسیوں کی باتوں سے متاثر ہوا کرتے ہیں۔

اس ملازم نے بتایا کہ مقتول سنیاسی کی باتوں سے مسحور ہوا اور اُسے کہا کہ اُس کے پاس ایک سَو روپیہ تو نہیں لیکن وہ یہی دوائی لے گا۔ اُس کی منت سماجت سے سنیاسی پچاس روپے تک آ گیا۔ مقتول نے اُسے پینتالیس روپے دیئے اور اپنے کسی بالکے سے کہا کہ اسے شیشی میں سات آٹھ قطرے "وہی" دوائی ڈال دے۔ دوائی دینے سے پہلے سنیاسی نے اُسے طریقہ استعمال بتا دیا تھا کہ یہ مُنہ کے رستے نہیں لینی، اسے خون میں شامل کرنا ہے جس کا ذریعہ انجکشن ہے۔ اُس نے مقتول سے کہا — "اسی لئے یہ صرف راجے مہاراجے استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے پاس ڈاکٹر ہوتے ہیں جو انہیں گھر آ کر انجکشن کر جاتے ہیں۔ عام لوگوں کو انجکشن نصیب نہیں ہوتا۔"

مقتول کے پاس انجکشن کا انتظام تھا۔ ہسپتال کا ملازم اُس کا دوست تھا۔ اُس نے سنیاسی کو پینتالیس روپے دیئے اور بالکے نے اُسے شیشی میں دوائی ڈال دی۔ وہ وہاں سے سیدھا ہسپتال چلا گیا اور اپنے دوست سے ملا۔ اُسے بتایا کہ اس دوائی کا انجکشن کرنا ہے۔ اس ملازم نے اُسے کہا کہ وہ ہسپتال میں انجکشن نہیں کر سکتا۔ وہ شام کو سرنج چوری چھپے گھر لے آئے گا۔ اُن کی دوستی گہری تھی۔ ملازم نے دوستی کا حق ادا کیا۔ شام کو سرنج گاؤں میں لے آیا۔ مقتول نے شام کا کھانا اُسی کے گھر کھایا۔ اس کے بعد اس دوست نے مقتول کو اس دوائی کا انجکشن دے دیا۔

موت اذیت ناک تھی

ملازم نے اپنے بیان میں کہا کہ انجکشن لگنے کے آدھ پون گھنٹہ بعد مقتول نے سر کی گرانی اور جسم میں کچھ بے چینی کی شکایت کی۔ ملازم نے اُسے کہا کہ سنیاسیوں اور جوگیوں کی دوائیوں میں یہ اثر ہوتا ہے کہ جو دوائی کام کرنے والی ہوتی ہے وہ جسم میں بے چینی پیدا کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو سمجھ لو کہ دوائی بے کار ہے۔ باتیں کرتے کرتے ملازم نے اُسے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو لے آتے۔ وہ مان گیا اور بولا کہ ابھی چلا جاتا ہوں۔ ملازم نے اُسے کہا کہ یہ کوئی وقت نہیں لیکن وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ غصے میں کہنے لگا کہ میرے جسم میں آگ لگ رہی ہے۔ میں ابھی جاؤں گا۔ وہ نہ آئی تو اُسے اُٹھا کر لے آؤں گا۔ میرے جسم میں طاقت آگئی ہے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

"رات کو گاؤں میں شور شرابا سا سُنا" — ملازم نے اپنے بیان میں کہا — "میری آنکھ کھُل گئی۔ باہر آیا تو پتہ چلا کہ مقتول کی لاش کھیتوں میں پڑی ہے۔ میں دوڑا گیا اور لاش دیکھی۔ کپڑوں پر خون نہیں تھا۔ کوئی چوٹ نظر نہیں آرہی تھی۔ وہاں نمبردار دو آدمی کھڑے کر کے تھانے چلا گیا تھا۔ انہوں نے لاش کے قریب نہ جانے دیا۔ مجھے یہ شک ہوا کہ میں نے اسے جس دوائی کا انجکشن دیا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ میں نے کسی کو بتایا نہیں۔

دوسرے دن میں بہت سویرے ہسپتال چلا گیا کیونکہ کمپاؤنڈروں کے آنے سے پہلے مجھے سرنج واپس رکھنی تھی۔ میں نے سرنج اُبلتے پانی میں رکھی اور اسے خوب دھویا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خیال بھی آتا رہا کہ سنیاسی ایسے جاہل تو نہیں ہو سکتے کہ زہریلی دوائی دے دیں۔ موت کا باعث کچھ اور ہوگا۔ میں پوسٹمارٹم رپورٹ کا انتظار کرتا رہا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد کمپاؤنڈر نے بتایا کہ مقتول کو زہر کا انجکشن دیا گیا ہے اور بازو میں جہاں سوئی داخل ہوئی تھی وہاں زہر کا اثر بڑا صاف ہے....

"مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اسی دوائی کا اثر ہے۔ میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یہ خطرہ نظر آیا کہ یہ کوئی تیز زہر تھا جو سرنج میں اُبلتے پانی سے بھی شاید نہ دُھلے۔ میں ڈر گیا کہ کسی کو اس سرنج سے ڈاکٹر صاحب کا لکھا ہُوا انجکشن دیا تو زہر کا اثر اُس میں بھی چلا جائے گا۔ کمپاؤنڈر ایک مریض کو دوائی دے رہا تھا۔ میں نے سرنج صاف کرنے کے بہانے اُٹھائی اور فرش پر پھینک دی۔ یہ کانچ کی تھی۔ ٹوٹ گئی۔ کمپاؤنڈر نے مجھے ڈانٹا اور گالیاں بھی دیں۔ میں نے دل میں کہا کہ میری تنخواہ سے دس سرنجوں کی قیمت کاٹ لی جائے تو بھی مجھے افسوس نہیں ہوگا میں نے سرنج توڑ کر کسی اور کو مرنے سے بچا لیا تھا۔"

میں نے اُس سے اُس کے بیان کے مطابق بہت کچھ پوچھا۔ یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ کہاں تک سچ کہہ رہا ہے۔ وہ سچا معلوم ہوتا تھا۔

"یہ یاد کر کے بتاؤ کہ وہ جب جانے کے لئے اُٹھا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ وہ ابھی اپنی بیوی کو لائے گا تو تم نے محسوس کیا تھا کہ اُس کی

باتوں میں، انداز میں غیر معمولی تبدیلی آگئی ہے؟"

"بڑ مارنا اُس کی عادت تھی" — اُس نے جواب دیا —— "لیکن وہ جب اُٹھا اور بولنے لگا تو میں نے محسوس کیا تھا کہ اُس میں کوئی تبدیلی آگئی ہے اور یہ اس دوائی کا اثر ہے۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ اُس کا دماغ صحیح نہیں رہا تھا یا اُس میں بھینسے اور گینڈے جیسی طاقت آگئی تھی۔ اس طرح اُس نے پہلے کبھی بات نہیں کی تھی۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔"

میں نے بعد میں ڈاکٹر کی رائے لی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ یہ زہر کا اثر معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا دماغ اُس کے قابو میں نہ رہا۔ زہر کی تلخی کو وہ طاقت سمجھتا رہا اور اپنی بیوی کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ سیدھے راستے سے نہیں گیا ہوگا۔ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا ہوگا۔ گرا بھی ہوگا۔ آخر وہاں گرا جہاں اُس کی لاش پڑی تھی۔ یہ بڑی اذیت ناک موت مرا ہوگا۔

یہ ثواب کا کام ہے

یہ آدمی مقتول کے ساتھ سنیاسیوں تک نہیں گیا تھا۔ مقتول نے اسے صرف یہ بتایا تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ جوگی، سنیاسی اور سپیرے خانہ بدوش ہُوا کرتے تھے۔ جنگلوں میں سانپوں اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں پھرتے رہتے اور کہیں عارضی طور پر ویرانوں میں قیام کرتے تھے۔ ان کی دوائیوں کے متعلق عجیب و غریب کہانیاں مشہور ہُوا کرتی تھیں۔ دیہاتی لوگ کہا کرتے

تھے کہ اِن کے پاس ایسی دوائی بھی ہے جو انسان کو ڈیڑھ سو سال تک بوڑھا نہیں ہونے دیتی۔ لوگ ان کی بہت آؤ بھگت اور خدمت کیا کرتے تھے۔ ہندوؤں میں یہ زیادہ مقبول تھے اور قابلِ احترام سمجھے جاتے تھے۔

مجھے اِن سنیاسیوں کے ڈیرے پر چھاپا مارنا تھا مگر احتیاط سے۔ اگر میں تھانیدار بن کر وہاں جاتا تو سنیاسی کہہ سکتا تھا کہ اُس نے کسی آدمی کو پینتالیس روپے کی کوئی دوائی نہیں دی۔ وہ فوراً سمجھ جاتا کہ یہ پولیس جو آئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ایسا کوئی گواہ نہیں تھا جو سنیاسی کو پہچانتا ہو یا یہ ثابت کر سکتا ہو کہ مقتول نے اس سے دوائی لی تھی۔ ہسپتال کے اس ملازم کو اپنے ساتھ لے جانے سے بھی میرا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بھی سنیاسی کو نہیں پہچانتا تھا، اور مجھے یہ شک بھی تھا کہ اس آدمی نے مقتول کو قتل کرنے کے لئے اسے زہر کا انجکشن طاقت کی دوائی کے دھوکے میں دیا ہے۔ اس شخص کے حق میں صرف یہ بات جاتی تھی کہ اُس نے سرینج پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد توڑی تھی جس کا گواہ کمپاؤنڈر تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے اس سے پہلے معلوم نہیں تھا کہ اُس کے ہاتھوں مقتول نے زہر کا انجکشن لیا ہے۔

اس ملازم کے بیان میں مجھے بعض باتیں مشکوک نظر آ رہی تھیں۔ اس کے سارے بیان کو میں نے سچ نہیں سمجھ لیا تھا۔ مجھے یہ دیکھنا تھا کہ دوائی دینے والے سنیاسی کا وجود ہے یا یہ ملازم کے افسانے کا فرضی کردار ہے۔ میں نے یہ طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا کہ جوانی کی تلاش میں

مارا مارا پھرنے والا دولتمند جاگیردار بن کر سنیاسی کے پاس جاؤں۔ مجھے کامیابی کی سو فیصد توقع نہیں تھی لیکن ایک سراغ کا واضح اشارہ ملنے پر میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ سنیاسی کے نہ ملنے سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ انجکشن لگانے والے ملازم نے مجھے گمراہ کیا ہے اور وہ مجرم ہے۔

رات بہت گزر گئی تھی۔ میں مسلسل تفتیش سے تھک بھی گیا تھا اور یہ وجہ بھی تھی کہ میں جوگیوں اور سنیاسیوں کے نخرے جانتا تھا۔ انہیں نیند سے جگانا ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے ملازم کو حوالات میں بند کر دیا۔ جن لوگوں کو تھانے بٹھا رکھا تھا، انہیں ڈرا دھمکا کر گھروں کو جانے کی اجازت دے دی۔ عباس جانے کی بجائے میرے پاس آ گیا۔

"عالی جاہ!" — اُس نے مجھے کہا — "اگر آپ نے مجھے اس بنا پر قتل کے شبے میں بلایا تھا کہ اُرملا کا میرے ساتھ میل جول ہے تو میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے گھر نہ جانے دیں۔ اپنی تسلی کر کے مجھے چھوڑیں۔ اگر عالی جاہ ناراض نہ ہوں تو میں یہ بھی کہہ دیتا ہوں کہ میں اُرملا کی محبت سے انکار نہیں کروں گا۔ اگر اس لڑکی نے کہہ دیا ہے کہ میرا دل عباس کے ساتھ ہے تو عباس سُولی پر کھڑا ہو کر بھی کہے گا کہ ہاں، میرا دل اُرملا کے پاس اور اُس کا میرے پاس ہے۔"

مجھے یہ جوان بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر رونق، جسم میں جان اور باتوں میں بھی جان تھی۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اور مسکرا کر کہا — "عباس یار! مجھے رُعب دے رہے ہو؟ کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"عالی جاہ!" — اُس نے کہا — "رُعب کی کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اُرملا کو میری بیوی بننا ہے۔ وہ اب میرے پاس آئے گی۔ اُسے ساری عمر بیوہ رہنے کے لئے ہندو نہیں رہنے دوں گا۔ اُسے میرے پاس ہی آنا تھا۔ اس کے لئے اس کے خاوند کو قتل کرنا یا کسی اور طریقے سے راستے سے ہٹانا بالکل ضروری نہیں تھا۔ اُرملا نے اُسے اپنے پاؤں کے نیچے رکھا ہُوا تھا۔ وہ اُس کی زندگی میں میرے پاس آسکتی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے پوچھا تھا کہ یہ لڑکی طلاق لئے بغیر میرے ساتھ شادی کر سکتی ہے؟ انہوں نے کہا تھا کہ لڑکی اسلام قبول کرلے تو اُس کی پہلی شادی جو ہندو مذہب کے تحت ہوتی ہے منسوخ ہو جاتی ہے۔ اُسے اسلامی شریعت کے تحت شادی کرنی پڑے گی جو وہ ہندو خاوند سے طلاق لئے بغیر کر سکتی ہے۔"

"تم اُس کی شادی سے پہلے اُسے کیوں نہ لے گئے؟"

"میرے والدین نہیں مانتے تھے" — اُس نے جواب دیا — "میں نے انہیں دھمکی دی ہے کہ انہوں نے مجھے اس لڑکی کو گھر لانے سے روکا تو میں فوج میں بھرتی ہو کر لڑائی میں چلا جاؤں گا۔ وہ مان گئے ہیں۔ ہمارے گاؤں کے دو بزرگ ہیں۔ انہوں نے بھی میرے والد کو منوالیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندو لڑکیوں کو لالا کر مسلمان کرتے رہو، یہ ثواب کا کام ہے۔"

میری ہنسی نکل گئی۔ میں نے کہا — "اُرملا بھی تھانے آئی تھی۔ تم اُسے مل تو نہیں سکے ہو گے۔"

"وہ سب کے سامنے میرے پاس آگئی تھی" — اُس نے کہا — "اُس

نے مجھے وہ ساری باتیں بتائی ہیں جو اُس نے آپ کو بتائی ہیں۔ اُس نے مجھے کہا تھا، دیکھو عباس میں نے جھوٹ نہیں بولا، تم بھی جھوٹ نہ بولنا۔"

میں نے اُسے گھر بھیج دیا۔

میں نواب اور جاگیردار بن گیا

ایک کانسٹیبل کو میں نے سمت بتا کر کہا کہ وہ دیہاتی لباس میں ندی کے ساتھ ساتھ جائے اور دیکھے کہ کسی جگہ جوگیوں اور سنیاسیوں نے ڈیرہ ڈال رکھا ہے؟ میں نے اسے کہا کہ ابھی جائے اور علی الصبح مجھے بتائے۔ میں جا کر سو گیا۔ صبح اسی کانسٹیبل نے مجھے جگایا اور بتایا کہ فلاں جگہ سنیاسیوں کا ڈیرہ موجود ہے۔ میں نے پرائیویٹ کپڑے پہنے اور گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ چار کانسٹیبلوں اور ہیڈ کانسٹیبل کو دیہاتیوں کے لباس میں اس طرح وہاں جانے کو کہا تھا کہ الگ الگ ہو کر سنیاسیوں کے ڈیرے کے ارد گرد اور قریب رہیں اور میرے اشارے کا انتظار کریں۔ یہ محض احتیاطی تدبیر تھی۔

میں سنیاسیوں کے ڈیرے میں جا کر گھوڑے سے اُترا۔ انہوں نے خیمہ شاید خود ہی مختلف کپڑے جوڑ کر سی رکھا تھا۔ باہر ایک سپیرا بین بجا رہا تھا اور ایک سانپ اُس کے آگے پھن پھیلائے جھوم رہا تھا۔ اس گروہ میں سپیرے بھی تھے۔ میں نے اُنہی کے ایک لڑکے سے پوچھا کہ ان کا

گوروکہاں ہے۔ اُس نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ میں گھوڑے سے اُتر کر اندر چلا گیا۔ اندر ایک بوڑھا سا جوگی چوکڑی مارے بیٹھا تھا۔ اُس کے اردگرد تھیلیاں اور ٹوکریاں رکھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اُس نے اپنے اُوپر مراقبے کی کیفیت طاری کر لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے اُس کے گھٹنے چھُو کر ہاتھ جوڑے اور اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

وہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ چکا تھا۔ خُدا نے مجھے قد بُت کچھ لمبا چوڑا عطا کیا ہے اور اُس زمانے میں میرا رنگ رُوپ ذرا سفیدی مائل تھا۔ لباس بھی اچھا تھا اور گھوڑا بھی اچھی نسل کا تھا۔ اس سے سنیاسی بغیر پوچھے مجھے نواب یا کوئی جاگیردار سمجھ بیٹھا۔

"کیسے آئے ہو؟" — اُس نے مخمور سے لہجے میں پوچھا۔

میں نے اُسے بتایا کہ میری جوانی ڈھلنے لگی ہے۔ خدا نے سب کچھ دیا ہے مگر ایک خواہش ہے کہ.... اُس نے میرا فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا — "کہ جوانی ختم نہ ہو۔"

"یہی خواہش لے کر آیا ہوں مہاراج!" — میں نے کہا — "سونے اور مروارید کے کُشتے بہت کھاتے ہیں۔ میں ادھر شکار کے لئے آیا تھا میرے نوکر کو کسی نے بتایا تھا کہ یہ خزانہ آپ کے پاس ہے۔ وہ آپ کے پاس پرسوں اترسوں آیا تھا۔ آپ نے اُسے دوائی کے چند ایک قطرے دیئے تھے جو انجکشن کے ذریعے لینے تھے۔ اُس نے یہ دوائی لی اور اگلے ہی روز میں نے اُسے دیکھا تو پہچان نہ سکا۔ اُس کا رنگ سُرخ ہو گیا ہے اور اب چار گنا

زیادہ بوجھ اُٹھاتا اور گھوڑے کی طرح کام کرتا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ تم یہ خون اور یہ طاقت کہاں سے لاتے ہو۔ اُس نے آپ کا اتا پتہ بتایا۔ میں کسی کو بتائے بغیر آیا ہوں۔ مجھے وہی دوائی دے دیں۔"

وہ مقتول کو میرا نوکر سمجھا۔ کہنے لگا — "وہ دوائی ہے ہی آپ جیسے نوابوں اور راجوں مہاراجوں کے لئے.... ایک جڑی ہے جو زمین کے نیچے ہی پک کر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ امرت رس (آبِ حیات) ہے۔ کسی کو یہ نظر نہیں آتی۔ ہمیں اُستاد نے اس کی تلاش کا گُر سکھایا تھا۔ ہم نے حاصل کر لی ہے۔ آپ کا نوکر خوش قسمت تھا کہ ہم اُس پر مہربان ہو گئے۔ من کی موج میں آکر اُسے دو چار قطرے دے دیئے۔ آپ بھی لے جائیں لیکن پانچ قطروں کے ہم ایک سو روپیہ لیں گے۔ یہ تو ایک لاکھ کی چیز ہے لیکن پرمیشور کو بھی مُنہ دکھانا ہے۔"

میں نے ایک سو روپیہ نکالا اور اُس کے آگے رکھ دیا۔ یہ سرکاری رقم تھی۔ مجھے اطمینان تھا کہ یہ مجھے واپس مل جائے گی۔ سنیاسی نے اپنے ہاتھ سے چھوٹی سی ایک شیشی میں مجھے لال رنگ کے پانچ چھ قطرے ڈال دیئے۔ اس دوائی کی اُس نے اتنی کرامات سنائیں اور ایسے لہجے میں سنائیں کہ میرے دل میں آئی کہ یہ چند ایک قطرے ابھی مُنہ میں ڈال لوں۔ اُس نے کہا کہ یہ انجکشن کے ذریعے خون میں شامل کرنا۔

میں دوائی لے آیا۔ مجھے یہ دوائی اُسی لیبارٹری میں بھیجنی تھی جہاں مقتول کے جگر اور گُردوں کے ٹکڑے گئے تھے۔ میرے آدمی جو دیہاتی

لباس میں اِدھر اُدھر بکھرے اور چھپے ہوتے تھے، مجھے جاتا دیکھ کر میرے پیچھے آتے۔ میں نے ان میں سے دو آدمیوں کو یہ کام سونپا کہ وہ سنیاسیوں کے ڈیرے سے دُور رہیں اور نظر رکھیں۔ اگر یہ لوگ کہیں چلے جائیں تو ان کا پیچھا کریں۔

میں نے تھانے میں جا کر شیشی ہسپتال کے ملازم کو دکھائی۔ وہ حوالات میں بند تھا۔ اُس نے کہا کہ یہ وہ دوائی نہیں۔ یہ لال رنگ کی ہے اور وہ پانی کے رنگ کی تھی۔ ذرا سفیدی مائل تھی۔ میں چکرایا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کروں سنیاسی یہ نہ کہہ دے کہ اُس نے "میرے نوکر" کو یہی دوائی دی تھی میں نے بہت سوچا اور ایک بار پھر سنیاسی کے ڈیرے کو چل پڑا۔ اب بھی میرا عملہ ساتھ تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر کچھ حیران ہُوا۔ میں نے التجا کے لہجے میں اُسے کہا کہ میرے نوکر نے کہا ہے کہ آپ نے اُسے جو دوائی دی ہے وہ پانی کی طرح تھی، اُس کا رنگ سُرخ نہیں تھا۔ مجھے وہی دوائی دیں کیونکہ میں اپنے نوکر پر اس کا اثر دیکھ چکا ہوں۔

"اتنے بڑے آدمی ہو کر اپنے نوکر پر اعتبار کرتے ہو؟" ــــ اُس نے غصے سے کہا ــــ "ہم نے اُسے یہی دوائی دی تھی۔"

"مہاراج نے شاید اپنے ہاتھ سے نہیں دی تھی" ــــ میں نے کہا۔

"ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو" ــــ اُس نے کہا ــــ "ہم نے بالکے سے کہا تھا کہ اسے دوائی ڈال دو" ــــ اُس نے کسی کا نام پُکارا تو تیرہ چودہ سال کی عمر کا ایک لڑکا اندر آیا۔ اُس نے لڑکے سے پوچھے ــــ "پرسوں ایک آدمی یہاں

آیا تھا۔ ہم نے تجھے کہا تھا کہ اس شیشی میں سے چھ سات قطرے دوائی اسے ڈال دو" ــــ اُس نے لال دوائی والی بڑی شیشی اُسے دکھا کر کہا ــــ "تو نے اسی میں سے اُسے دوائی دی تھی نا؟ ہماری توجہ سانپ کی طرف ہو گئی تھی۔ ٹوکری سے نکل گیا تھا۔"

میں نے لڑکے کو دیکھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ سنیاسی کی ڈانٹ پر اُس نے خوفزدہ لہجے میں کہا ــــ "آپ نے مہاراج اِس شیشی کی طرف اشارہ کیا تھا" ــــ اُس نے ایک اور شیشی اُٹھا کر سنیاسی کو دکھاتے ہوئے کہا ــــ "میں نے اس میں سے اُسے چھ سات قطرے ڈال دیئے تھے۔"

سنیاسی بم کی طرح پھٹا ــــ "اس میں سے؟ .... اوتے مُورکھ! پھر سوچ .... تُو نے اس میں سے قطرے ڈال دیئے تھے؟"

"ہاں مہاراج!" ــــ لڑکے نے کہا ــــ "اسی میں سے قطرے ڈال دیئے تھے۔"

سنیاسی کا رنگ کالا تھا۔ یہ رنگ زرد ہو گیا۔ اُس نے میری طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا اور کچھ دیر دیکھتا ہی رہا۔ میں خاموش رہا اور جان گیا کہ مقتول کو غلط دوائی دی گئی تھی۔ میں نے وہ شیشی اُٹھالی جو بالکے نے اُسے دکھائی تھی۔

"اسے رکھ دو" ــــ اُس نے جھپٹا مار کر کہا۔ میں نے ہاتھ اپنی طرف کر لیا۔ اُس نے کہا ــــ "یہ شیشی مجھے دے دو۔ اس میں سانپوں کا زہر ہے"

—میں اُٹھا اور خیمے سے باہر آ کر دو انگلیاں مُنہ میں ڈال کر وِسل بجائی۔ چاروں کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل دوڑے آئے۔ دو کانسٹیبلوں نے کرُتوں کے نیچے ہتھکڑیاں کمر کے گرد لپیٹ رکھی تھیں۔ سنیاسی باہر آ گیا۔ میں نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ اسے ہتھکڑی لگا لو اور سب کو تھانے لے چلو۔ تمام راہ سنیاسی میری منتیں کرتا اور بولتا رہا۔

سات سانپوں کا زہر

تھانے میں بٹھا کر اسے کہا کہ اب اپنی کہانی سناؤ۔ اُس نے مجھ سے پوچھا— "آپ کے لڑکا کا کیا حال ہے؟ آپ کہتے تھے کہ اس دوائی نے اُسے بہت طاقت دی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے اِس شیشی میں سے دوائی نہیں دی گئی، ورنہ وہ مر جاتا۔"

"وہ مر چکا ہے"— میں نے کہا— "اور اُس کی لاش جلائی جا چکی ہے۔"

"اُس کی موت لازمی تھی"— اُس نے کہا۔

اُس نے بتایا کہ مقتول اُس کے پاس گیا اور کس طرح اُس سے طاقت کی دوائی مانگی۔ سنیاسی نے ایک سو روپیہ قیمت بتائی۔ پینتالیس روپے پر سودا طے ہو گیا۔ مقتول نے رقم سنیاسی کو دے دی۔ عین اُس وقت سنیاسی کے پیچھے رکھی ہوئی ایک ٹوکری میں سے سانپ نکل آیا۔ ڈھکنا ڈھیلا تھا۔

سنیاسی نے اپنے بالکے سے کہا کہ اُس شیشی میں سے (مقتول) کو پانچ چھ قطرے دوائی ڈال دے۔ سنیاسی نے چھوٹی سی ایک شیشی نکال رکھی تھی۔ بالکے نے اشارہ غلط سمجھا اور اُس شیشی میں سے پانچ چھ قطرے ڈال دیئے جس میں سانپوں سے نکالا ہوا زہر تھا۔

"یہ سات سانپوں کا زہر ہے"— سنیاسی نے اپنے بیان میں کہا— "ہم سانپ بھی پکڑتے ہیں اور ان کا زہر نکال کر دوائیوں میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ میری غلطی ہے کہ میں نے یہ شیشی دوائیوں والی شیشی کے ساتھ رکھ دی تھی۔"

اُس کے بالکے نے بیان دیا کہ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اس شیشی میں زہر ہے۔ سنیاسی کا دھیان ٹوکری سے نکلے ہوئے سانپ کی طرف تھا۔ اُس نے اسی دوران شیشیوں کی طرف اشارہ کر کے بالکے سے کہا تھا کہ مقتول کو اس کے چند قطرے ڈال دو۔ بالکے نے بتایا کہ سنیاسی کا ہاتھ اسی شیشی کے قریب تھا۔ اُس نے اسی میں سے چند قطرے مقتول کو دے دیئے۔ مقتول قیمت ادا کر چکا تھا۔ وہ سات سانپوں کا زہر اُٹھائے ہسپتال کی طرف اُٹھ دوڑا۔ وہ اپنے دوست سے اس دوائی کا انجکشن اُسی روز لینا چاہتا تھا تاکہ شام تک اُس میں بھینسے اور گینڈے جیسی طاقت آ جائے۔

میں نے سنیاسی اور اُس کے بالکے کو بھی حوالات میں بند کر دیا اور سانپوں کے زہر والی شیشی اپنے اے۔ ایس۔ آئی کے ہاتھ ایک سو میل دُور کے ماہرین کے پاس بھیج دی جن کے پاس مقتول کے جگر اور گُردوں کے

ٹکڑے معائنے اور رپورٹ کے لئے گئے تھے۔ وہاں سے تین روز بعد دونوں رپورٹیں اکٹھی آئیں۔ لکھا تھا کہ مقتول کو زہر موت سے اندازاً دو یا تین گھنٹے پہلے دیا گیا تھا اور یہ زہر سانپ کا SNAKE POISON تھا۔

یہ واردات ۳۰۲ (قتل) کی نہ رہی۔ ۳۰۴ (اتفاقیہ یا حادثاتی قتل) بن گیا۔ مقدمہ ٹیکنیکل بن گیا۔ عدالت میں سرکاری وکیل اور صفائی کے وکیلوں کے درمیان قانونی نکات پر خوب معرکہ ہُوا۔ آخر زہر دینے والے سنیاسی اور انجکشن لگانے والے کمپاؤنڈر کو چار چار سال سزائے قید بامشقت دی گئی۔

ملاقات اس مکان میں

اُجڑے ہُوئے اس مکان کے متعلق مشہور تھا کہ آسیب زدہ ہے۔ اگر یہ مکان یورپ میں ہوتا تو لوگ کہتے کہ اس میں بدروحیں رہتی ہیں جو رات کو مکان کے اندر سفید کپڑوں میں ملبوس گھومتی پھرتی یا ناچتی گاتی ہیں لیکن ہماری سرزمین کے آسیب زدہ مکانوں میں جنّ اور چڑیلیں رہتی ہیں۔ یہ مخلوق بدروحوں کی طرح نظر نہیں آتی۔ اگر کوئی انسان انہیں غلطی سے پریشان کرے تو اُس پر جنّات کا قبضہ ہوجاتا ہے۔ پھر جنّ نکالنے والے عاملوں اور شاہ صاحبوں کی روزی کُھل جاتی ہے۔

یہ ایک قصبے کی واردات ہے۔ اس قصبے کی تین چوتھائی آبادی ہندوؤں کی تھی، باقی مسلمانوں کی۔ چند ایک گھر سکھوں کے بھی تھے۔ ایک صبح تین مسلمان تھانے میں ایک رپورٹ لے کر آئے۔ ان میں ایک آدمی ٹاؤن کمیٹی کا ممبر تھا اور دو اُس کے محلّے کے معزّزین تھے۔ رپورٹ یہ تھی کہ ٹاؤن کمیٹی کے ممبر کا جوان بیٹا جس کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی، اُس اُجڑے ہُوئے مکان میں بے ہوش پڑا پایا گیا۔ بچّے اس مکان میں

کھیلنے جایا کرتے تھے۔ بچّے صبح ہی صبح وہاں گئے تو ایک آدمی کو اندر برآمدے میں پڑا دیکھا۔ بچّے ڈر کر اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے۔ ان گھروں کے آدمی بچوں سے سُن کر اُجڑے ہُوئے مکان کو دوڑے۔ انہوں نے دیکھا کہ جو کوئی وہاں پڑا ہے وہ زندہ ہے ـــــ وہ ٹاؤن کمیٹی کے اس مسلمان ممبر کا جوان بیٹا تھا۔

اُسے ہلایا، ہلایا مگر اُس کی آنکھیں نہ کھلیں۔ وہ بے ہوش تھا۔ اس کے باپ کو اطلاع دی گئی۔ اُس نے بھی آکر اپنے بیٹے کو دیکھا۔ باپ اپنے بیٹے کو وہاں کیسے پڑا رہنے دیتا لیکن سب نے اُسے مشورہ دیا کہ پولیس کو بلایا جائے۔ باپ دو آدمیوں کے ساتھ تھانے آیا۔ وہ اُدھورے اُدھورے فقرے بولتا اور بار بار کہتا ـــــ "ملک صاحب! جلدی چلیے۔ ڈاکٹر کو ساتھ لے چلیے" ـــــ اُس کے آنسو رُکتے نہیں تھے۔

میں خود جلدی میں تھا۔ وہ جو بے ہوش پڑا تھا میرے پہنچنے تک مر بھی سکتا تھا۔ انسانی ہمدردی کے علاوہ مجھے نزعی بیان لینا تھا، ورنہ اُس کے مر جانے کی صورت میں تفتیش میرے لئے محال ہو سکتی تھی۔ میں نے ان تینوں سے جو معلومات لینی تھیں لیں اور کاغذی کارروائی عجلت میں مکمل کر کے چل پڑا۔ جا کر دیکھا۔ وہ ابھی زندہ تھا اور بے ہوش۔ اُسے اِدھر اُدھر کر کے جسم کا نظری معائنہ کیا۔ سر کی چوٹی پر اُبھار تھا۔ یوں سمجھیے کہ یہ چوٹ سر کے پچھلے حصّے کے اُوپر تھی۔ سارے جسم پر ایک ہی چوٹ تھی جو لاٹھی یا ڈنڈے کی لگی تھی۔ اس کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جسم جُثّے کا اچھا تھا۔ مجھے اس

کا نام یاد نہیں رہا۔ اسے آپ حمید کہہ لیں۔

اسے ہسپتال بھجوایا۔ قصبے میں ایک سرکاری ہسپتال تھا جہاں ایک ہی ڈاکٹر تھا۔ پوسٹمارٹم یہی ڈاکٹر کیا کرتا تھا۔ زخموں اور چوٹوں کا معائنہ بھی وہی کرتا تھا اور عدالت میں اس کی رپورٹ اور شہادت قابلِ اعتماد سمجھی جاتی تھی۔

اِس مکان کی تشریح ضروری ہے۔ یہ ایک آباد محلّے میں واقع تھا۔ بڑے دروازے کے سامنے سے گلی گزرتی تھی۔ باقی تین اطراف دوسرے مکان تھے۔ یہ اُجڑا ہُوا مکان تھا۔ اس میں ایک ہندو خاندان آباد تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوتا گیا۔ دو بھائی باقی رہ گئے تھے۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں دلّی چلے گئے اور وہیں آباد ہو گئے تھے۔ مکان خاصا فراخ تھا۔ تین اطراف میں رہائشی کمرے اور ان کے سامنے برآمدہ تھا۔ ایک طرف ڈیوڑھی اور رسوئی وغیرہ تھی۔ صحن کشادہ تھا۔ صحن میں دو درخت تھے۔ ایک شہتوت اور دوسرا نیم کا۔ نیم کا درخت بہت پرانا تھا اس لئے ہر طرف پھیل گیا تھا۔ اُس کا ایک ٹہن برآمدے کے منڈیر سے کوئی ایک فٹ اوپر چھت تک چلا گیا تھا۔ یہ موٹا اور مضبوط ٹہن تھا۔

مکان اتنا قدیم کہ برآمدوں کی چھتیں کہیں کہیں سے جھک آتی تھیں۔ ایک کمرے کی چھت گری ہوئی تھی۔ یہ پرانے زمانے کی تعمیر تھی جس میں چھتوں کے نیچے شہتیر استعمال ہوتے تھے۔ ساری چھت لکڑی کی اور اس پر مٹی ڈالی جاتی تھی۔ کمروں، برآمدوں اور ڈیوڑھی میں بھی ملبے کے ڈھیر پڑے تھے۔ چھتوں پر جالے ایسے جیسے پرانے کپڑے لٹک رہے ہوں۔ مکان کی اندرونی حالت

ڈراؤنی تھی۔ اس کے متعلق یہ روایت غلط معلوم نہیں ہوتی تھی کہ اس میں جنّ رہتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں ایک چڑیل بھی دیکھی گئی ہے۔ صرف بچّے کھیلنے کے لئے یا شہتوت کھانے کے لئے دن کے وقت اندر جایا کرتے تھے اور والدین انہیں اندر جانے سے روکتے تھے۔

فرش کچے تھے۔ صحن کچا تھا۔ مٹی ہی مٹی تھی جس پر پاؤں کے نشان (کھُرے) صاف تھے۔ زخمی جہاں پڑا تھا وہاں اُن لوگوں کے کھُرے تھے جو زخمی کو دیکھنے آتے تھے۔ اس سے ہٹ کر کچھ کھُرے تھے جو میری مدد کر سکتے تھے۔ یہ پولیس کا ہی کیس تھا۔ تھانے میں جب مجھے بتایا گیا تھا کہ مکان آسیب زدہ ہے تو میرے خیال میں یہ آتی تھی کہ حمید نوجوانی کے جوش میں یا کسی مقصد کے لئے رات کو مکان کے اندر گیا ہوگا اور ڈر کر بے ہوش ہو گیا ہوگا، مگر اُس کے سر پر چوٹ بتاتی تھی کہ جرم قابلِ دست اندازیٔ پولیس سرزد ہُوا ہے۔ کاغذات تو میں پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔

چونکہ کھُرے موجود تھا اس لئے کھوجی کی ضرورت تھی۔ وہ ایک میل دُور کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اُسے بلانے کے لئے ایک کانسٹیبل کو دوڑایا۔ میں نے خود کھُرے دیکھنے (جسے کھُرا اُٹھانا کہتے ہیں) کی کوشش نہ کی۔ میں اپنی کہانیوں میں بتا چکا ہوں کہ کھُرا اُٹھانا ایک مشکل اور پیچیدہ فن بلکہ ایک سائنس ہے۔ مجھے تجربہ تو تھا لیکن ایسا نہیں کہ میں کھوجی کہلا سکتا۔ بعض اوقات ایک پاؤں کے بمشکل ڈیڑھ دو انچ کے حصّے کا نشان دیکھ کر کھوجی وثوق سے بتا دیا کرتا تھا کہ یہ اُسی پاؤں کا نشان ہے جس کا سالم نشان پہلے دیکھا گیا ہے۔

حمید نے سلیپر پہن رکھے تھے۔ وہ میں نے اپنے پاس رکھ لئے تھے تاکہ کھوجی کے لئے کھُرا ڈھونڈنے میں آسانی رہے۔ مجھے یہ تفتیش آسان نظر آرہی تھی کیونکہ حمید کو تھوڑی دیر بعد ہوش میں آجانا تھا یا مجھے یہ اُمید تھی کہ وہ ہوش میں آجائے گا اور بتائے گا کہ وہ اس مکان میں کیوں آیا تھا اور اُسے کس نے مارا ہے، مگر اُس کے ہوش میں آنے تک میں تفتیش ملتوی نہیں کر سکتا تھا۔ میری آنکھیں مکان کے برآمدوں اور کمروں میں گھوم پھر رہی تھیں اور دماغ سوچ رہا تھا۔ حمید نوجوان تھا اور مکان غیر آباد جس میں لوگ اس لئے نہیں جاتے تھے کہ اس میں چڑیلیں اور جنّ رہتے تھے۔ اس لئے رات کو کوئی اندر جانے کی جرأت نہیں کرتا ہوگا۔ محلّے کے معزّزین بھی پورے یقین سے کہہ رہے تھے کہ یہ شہر شرار کی کارستانی ہے۔ میں ابھی ان کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ نوجوان اکیلا اندر نہیں آیا ہوگا۔ کسی کے ساتھ آیا ہوگا اور آنے کا مقصد کسی نہ کسی بدمعاشی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

حضرت سلیمانؑ کی اُمّت اور عامل

مجھے یہ امکان بھی نظر آرہا تھا کہ اسے گلی میں کہیں مارا پیٹا گیا اور جب بے ہوش ہو گیا تو اُسے اندر پھینک گئے۔ اس کی وجہ رقابت بھی ہو سکتی تھی اور یہ بھی کہ اس نے کسی کی بہن یا بیٹی کی عزّت پر ہاتھ ڈالا ہوگا۔

اگر یہ واردات رات کی ہوتی تو چوکیدار سے کوئی سراغ مل سکتا تھا۔ اُس وقت قصبوں میں سرکاری چوکیدار ہُوا کرتے تھے جو رات نو بجے سے صبح اذان سے ذرا پہلے تک گلیوں میں پہرہ دیا کرتے تھے۔ ہر محلّے میں ایک چوکیدار ہوتا تھا جو آنے جانے والوں کو روکتا اور دیکھتا تھا کہ کون ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جارہے ہیں۔ کسی محلّے میں چوری ڈکیتی کی واردات ہو جاتی تو چوکیدار شاملِ تفتیش ہوتا تھا۔ یہ انگریزوں کا انتظام تھا جس کی بدولت جرائم خاصے کم تھے۔ قصبوں میں اُس دَور میں سورج غروب ہوتے ہی بازار بند ہو جاتے اور چہل پہل ختم ہو جاتی تھی۔ کسی گلی میں کوئی جا رہا ہوتا تو وہ چوکیدار کی نظر میں رہتا تھا۔

میں نے متعلقہ محلّے کے چوکیدار کو اور چوکیداروں کے میٹ کو بلا لیا۔ سب سے پہلے حمید کے باپ کو الگ کر کے پوچھ گچھ شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر آدمی جس کے چہرے پر جوانی کی رونق ابھی باقی تھی، میرے قریب آیا۔

"آپ اتنے پریشان نہ ہوں"۔۔۔ اُس نے عجیب سی مسکراہٹ سے کہا۔۔۔ "یہ کسی انسان کا کام نہیں۔ میں نے لوگوں سے کہہ رکھا ہے کہ اس مکان کے اندر نہ آیا کریں۔ یہاں جنّات کا ایک بزرگ رہتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کے مرید جنّ بھی ہیں۔ بچّوں کو یہ کچھ نہیں کہتے۔ بڑی عمر کا کوئی آدمی یہاں آئے تو اُسے پہلے تو ہلکا سا دھکا لگتا ہے۔ اگر وہ باہر نہ نکلے تو اُسے جسم پر کہیں نہ کہیں ضرب پڑتی ہے۔ اس لڑکے کے ساتھ ایسے ہی ہُوا ہے"۔

"یہ اتنے زیادہ آدمی اندر آ گئے ہیں"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "دیکھو ذرا کس کس کو دھکا لگا یا ضرب پڑی ہے؟"

"میں رات کی بات کر رہا ہوں"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "رات کو یہاں اکیلے آنے کی جرأت نہ کریں"۔

"آپ کون ہیں؟"

"میں ہر کسی کا خادم ہوں"۔۔۔ اُس نے درویشوں کے لہجے میں جواب دیا۔۔۔ "میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس اُمّت کا بھی خادم ہوں جو اس مکان میں رہتی ہے۔ اس مخلوق کی خدمت کرتا ہوں اور لوگوں کو ان سے بچائے رکھتا ہوں۔ پھر بھی کوئی اِن جنّات کی بے ادبی کر دے تو وہ انتقام لیتے ہیں۔ میں ان کے قبضے میں آئے ہُوئے آدمی یا عورت کو چھڑا لیتا ہوں۔ مجھے سب پیر صاحب کہتے ہیں۔ جنّ، چڑیل، گھوٹ، پکڑ، آسیب کا قبضہ چھڑا دیتا ہوں۔ آپ سے پھر یہی کہوں گا کہ آپ کسی جنّ کو گرفتار نہیں کر سکتے۔ یہ کام میرے حوالے کریں۔ میں آپ کو وہ جنّ حاضر کر کے بھی دکھا دوں گا"۔

مجرم جنّات تھے یا ہندو؟

اُس نے اور بھی کئی دلیلیں دے کر مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ میں تفتیش ترک کر دوں۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے کاغذوں کا پیٹ بھرنا ہے

کیونکہ انگریز بادشاہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اُمت کی بالادستی کو قبول نہیں کرتا۔ میں نے یہ کہہ کر اُس سے گلو خلاصی کرائی کہ اُسے بوقتِ ضرورت خدمت کا موقع دوں گا۔ میں نے محلے کے معززین سے اُس کے متعلق پوچھا تو سب نے اُس کا نام احترام سے لیا اور کہا کہ میر صاحب "پہنچے" والے عامل ہیں۔ انہوں نے اُس کی کرامات بھی سنائی۔ میں نے حمید کے باپ کو الگ کر لیا اور اُس سے پوچھا کہ حمید کا چال چلن اور عام اخلاقی حالت کیسی تھی۔

باپ نے جواب دیا کہ اُس کا چال چلن بہت اچھا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کے اخلاق پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر اُس کا تعلق کسی عورت کے ساتھ تھا یا اُس کا اُٹھنا بیٹھنا آوارہ لڑکوں اور بدقماش لوگوں کے ساتھ تھا تو مجھے بتا دے کیونکہ اُس کے بیٹے پر ایک حملہ ہو چکا ہے۔ اگر میں نے اس کے دشمنوں کو نہ پکڑا تو ہو سکتا ہے وہ اسے اگلے حملے میں قتل کر دیں۔

"میں اس کی درپردہ زندگی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا" — باپ نے میری بات سمجھتے ہوئے کہا — "اس کے متعلق جو کچھ جانتا ہوں وہ بتا دیتا ہوں۔ میں اسے بی۔ اے تک تعلیم دلانا چاہتا تھا۔ کالج میں داخل کرایا وہاں ہوسٹل میں رہا مگر ایف۔ اے کر کے تعلیم سے مُنہ موڑ گیا۔ اس کا رجحان کاروبار کی طرف ہے لیکن توجہ نہیں دیتا۔ میرے پاس پیسہ ہے۔ اپنا کاروبار ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے میرے ساتھ کام کرتا ہے پھر ادھر اُدھر ہو جاتا ہے۔ اسے دراصل شوق پہلوان بننے کا ہے۔ صبح اذان سے پہلے

جاگ اٹھتا ہے اور چھت پر جا کر مالش اور ورزش کرتا ہے۔ اس نے مُگدر بھی رکھے ہوتے ہیں۔ شام کو اکھاڑے میں چلا جاتا ہے۔ ملنسار ہے۔ مجھ تک اس کی کبھی کوئی شکایت نہیں پہنچی۔ کبھی کسی کے ساتھ اس کے لڑائی جھگڑے کی خبر نہیں سُنی۔"

"رات کو گھر سے کس وقت غائب ہوا تھا؟" — میں نے پُوچھا۔

"حمید الگ کمرے میں سوتا ہے" — اُس کے باپ نے جواب دیا — "صبح ورزش کے لئے اُٹھتا ہے، پھر ناشتے کے لئے ماں کے پاس باورچی خانے میں بیٹھ جاتا ہے۔ ماں اسے دُودھ، بادام اور مکھن کے پراٹھوں کا ناشتہ دیتی ہے .... رات وہ اپنے کمرے میں سویا تھا۔ صبح ناشتے کے لئے نہ آیا۔ اُوپر جا کر دیکھا۔ تیل کی شیشی چھت پر رکھی تھی۔ لنگوٹ بھی رکھا تھا۔ حمید وہاں نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسی وقت باہر نکلا ہو گا۔"

باپ سے ہٹ کر میں نے محلے کے تین چار آدمیوں سے حمید کے متعلق پوچھا۔ کسی نے بھی ایسی بات نہ کی جس سے مجھے اس کے چال چلن پر شک ہوتا۔ دو آدمیوں نے کہا کہ لڑکا چلن کا صاف ہے اس لئے یہ اکھاڑے کا شہزادہ بنے گا۔

"ہندوؤں نے دو لڑکے تیار کر لئے ہیں" — ایک بزرگ نے کہا — "ہم ان کے مقابلے میں حمید کو تیار کر رہے ہیں۔ یہاں اکھاڑہ ہمیشہ ہندوؤں کے ہاتھ رہا ہے۔ حمید مسلمانوں کی آرزو پوری کر دے گا۔"

"ہندو پہلوانوں سے کبھی اس کی کُشتی ہوتی تھی؟" — میں نے پوچھا

—"حمید نے کبھی کسی ہندو پہلوان کو گرایا تھا؟"

"جی ہاں!"— تین آدمیوں نے بڑے فخر سے بیک وقت 'جی ہاں' کہا اور ایک نے سُنایا —"وہ دو کو گرا چکا ہے۔ اب ہم اسے بڑے پہلوانوں کے مقابلے میں اُتاریں گے۔"

"دراصل ملک صاحب!"— محلے کے بُزرگ نے رازداری سے کہا —"ہندو ہمارے لڑکے سے خار کھانے لگے ہیں۔"

"تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہندوؤں نے حمید کو ختم کرنے کی کوشش کی ہو؟"— میں نے ان کی رائے معلوم کرنے کے لئے پوچھا۔

"ہاں"— سب نے بیک زبان لمبی 'ہاں' کہی —"یہ ہو سکتا ہے" —ایک نے کہا —"حمید اکھاڑے میں اُترتا ہے تو ہندو اُسے گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔"

"اس صورت میں ہندو اسے قتل کر جاتے"— میں نے کہا —"وہ تو ڈنڈے یا لاٹھی کی ایک ضرب لگا کر چلے گئے۔"

"قتل؟"— ایک آدمی نے طنزیہ کہا —"اور ہندو کرتے؟.. اس قوم میں اتنی جرأت کہاں؟ .... اُن کی نیت قتل کی ہی ہو گی مگر ایک ضرب لگائی اور گھبرا کر بھاگ گئے۔"

"مجھے اس سوال کا جواب کون دے سکتا ہے کہ حمید رات کو اس مکان میں کیوں آیا تھا؟"

سب خاموش رہے۔

لڑکی کا جھانسہ

"جناب والا!"— میرے پیچھے کھڑے کسی آدمی نے کہا۔ میں نے اُدھر دیکھا۔ وہ عامل میر صاحب تھا جو مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کسی جن کی کارستانی ہے۔ اُس نے کہا —"میرے سوا آپ کو اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکتا۔ اگر آپ کو شک ہے کہ یہ نوجوان کسی عورت کے ساتھ آیا تھا تو یہ عورت انسان نہیں ہو گی بلکہ عورت کے روپ میں جن ہو گا یا چڑیل۔ اس نوجوان نے ناسمجھی میں جنات کی کہیں بے ادبی کر دی ہو گی .... اللہ کرے لڑکے کو جلدی ہوش آجائے۔ یہ آپ کو یہی بتائے گا کہ اسے ایک عورت نظر آئی تھی، پھر معلوم نہیں کدھر سے اُس کے سر پر چوٹ پڑی۔ وہ نہیں بتا سکے گا کہ اُسے مارنے والا کون ہے۔"

سب نے میر صاحب کی تائید کی اور مجھ پر زور دینے لگے کہ میں میر صاحب کی خدمات سے فائدہ اُٹھاؤں۔ اتنے میں کھوجی آگیا۔ میں کھوجی سے زیادہ اس خبر کا منتظر تھا کہ حمید ہوش میں آگیا ہے، مگر میں نے تھوڑی ہی دیر پہلے جس آدمی کو ہسپتال بھیجا تھا، وہ خبر لایا کہ حمید ابھی تک بے ہوش ہے اور ڈاکٹر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ڈاکٹر کی رپورٹ یہ تھی کہ سر کے سوا جسم پر کہیں بھی زخم یا ضرب کا نشان نہیں۔ سر کی چوٹ شدید بتائی گئی اور اس خطرے کا اظہار بھی کیا کہ کھوپڑی کی ہڈی مجروح یا ذرا

سی شکستہ ہوگئی اور دماغ بُری طرح مجروح ہوگیا ہوگا۔ اس سے یہ تھا کہ دماغ سے خون رِس رہا ہوگا۔ اس قسم کا خون جسم کے اندر ہی رہتا اور موت کا باعث بنتا ہے۔ قصبے کے ہسپتال میں کھوپڑی اور اس کے اندر کے معائنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ حمید کو پچیس میل دُور ضلعے کے ہسپتال میں معائنے کے لئے بھیجنا تھا۔ ڈاکٹر بھیجنے کا انتظام کر رہا تھا۔

مجھے یہ نقصان نظر آرہا تھا کہ حمید بے ہوشی کی حالت میں مر گیا تو میں نزعی بیان نہیں لے سکوں گا۔ میں نے ڈاکٹر کو تحریری پیغام بھیجا کہ زخمی کا نزعی بیان (اگر وہ ہوش میں آجاتے تو) ضرور لیا جاتے۔ ایسے کیسوں میں ڈاکٹر پولیس کے کہنے کے بغیر بھی بیان لے لیا کرتے تھے۔ مجھے ایک واردات یاد آتی ہے۔ میرے تھانے میں ایک لاش آئی جس کے جسم پر کلہاڑیوں کے زخم تھے۔ لاش کے ساتھ ڈاکٹر کا قلم بند کیا ہُوا نزعی بیان بھی تھا جس میں مقتول نے حملہ آوروں کی مکمل نشاندہی بمع نام کی تھی۔ یہ بیان اس طرح ریکارڈ ہُوا کہ ڈاکٹر (سول سرجن) دیہاتی علاقے کی سرکاری ڈسپنسریوں کے دَورے پر تھا۔ ایک کھڈ میں یہ زخمی پڑا نظر آیا۔ ڈاکٹر نے دیکھا کہ وہ سرگوشیوں میں بول سکتا ہے تو اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ اُس کا بیان قلم بند کیا۔ اس کے فوراً بعد وہ مر گیا۔ ڈاکٹر نے لاش اٹھوا کر تھانے بھیجی۔ پھر میں نے پوسٹ مارٹم کے لئے اسی ڈاکٹر کے پاس بھیج دی۔

مجھے حمید کے زندہ رہنے کا امکان ختم ہوتا نظر آنے لگا اور میں نے تفتیش پر یوں توجہ مرکوز کر لی جیسے وہ مر گیا ہو۔ تمام آدمیوں کو مکان سے

باہر نکال دیا۔ میر صاحب عامل وہیں رہا۔ میں نے اُسے بھی باہر نکال دیا۔ ان لوگوں سے کہا کہ حمید کے گھر سے دوستوں کو یہاں لے آئیں۔ میں نے کھوجی کو حمید کے سلیپر دے کر اُسے کھُرے تلاش کرنے کو کہا۔ کھوجی نے اپنا کام شروع کر دیا۔ میں اس سوچ میں غرق ہوگیا کہ اس واردات کی تحریک اور پس منظر کیا ہو سکتا ہے۔

میں نے اس پر بھی غور کیا کہ ہندوؤں نے حمید کو ختم کرنے کی کوشش اس ارادے سے کی ہوگی کہ یہ اُن کے پہلوانوں کو گرا نہ دے۔ ہندوؤں کی ذہنیت جیسی آج ہے ویسی ہی اُس زمانے میں تھی۔ ہمیشہ ہندوؤں کے لئے ناقابلِ برداشت رہا کہ مسلمان کسی بھی میدان میں ان سے آگے نکل جائیں۔ مسلمان کے قتل کو ہندو ہمیشہ جائز بلکہ قابلِ فخر سمجھتے رہے ہیں۔ اگر یہ واردات ہندوؤں کی ہی تھی تو مجھے ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے تھے کہ انہوں نے کیا جھانسہ دے کر اسے اس مکان میں بلایا اور انہوں نے اسے قتل کیوں نہیں کیا؟ .... اگر اسے بیکار ہی کرنا تھا تو اس کی ایک ٹانگ یا ایک بازو کیوں نہ توڑ دیا؟

جھانسہ ایک ہی ہو سکتا تھا۔ یہ تھا کوئی ہندو لڑکی۔ اگر یہ حسین جال استعمال کیا گیا تھا تو یہ میرے لئے حیران کُن نہیں تھا۔ مسلمانوں کی تباہی کے لئے ہندوؤں نے کئی موقعوں پر اپنی لڑکیاں استعمال کی ہیں۔ مجھے یہ لکھتے لکھتے دو تین وارداتیں یاد آگئی ہیں جو پھر کبھی سُناؤں گا۔ اس واردات میں اگر لڑکی استعمال کی گئی تھی تو اُس کا کھُرا موجود ہونا چاہیئے تھا۔ کھوجی کھُرے

دیکھ رہا تھا۔

میں نے کھوجی کو دیکھا۔ دُور سے ہی مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ اُسے کچھ نظر آگیا ہے۔ وہ زمین پر جُھکا ہُوا دیکھ اور نیم کے درخت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ درخت کے قریب جاکر اُس نے اُوپر دیکھا، پھر جوتی اُتاری اور درخت پر چڑھنے لگا۔ تنے کی شکل ایسی تھی کہ چڑھنا اُترنا مشکل نہیں تھا۔ وہ تنے پر چڑھتے رُک گیا اور اس پہ کچھ دیکھنے لگا۔ پھر اُوپر چڑھ گیا اور اُس ٹہن پر رُکا جو منڈیر کی طرف جاکر منڈیر سے آگے چھت کے اُوپر چلا گیا تھا۔ کھوجی اس ٹہن پر کھڑا ہُوا تو اُسے اُوپر والے ایک ٹہن کا سہارا مل گیا جسے اُس نے پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ منڈیر کی طرف جانے لگا۔

نصف تک جاکر وہ رُک گیا اور جس ٹہن پر کھڑا تھا اُس پہ بیٹھ گیا۔ وہاں کچھ دیکھتا رہا۔ اُٹھا اور ٹہن کو غور سے دیکھتا چھت پر جا پہنچا۔ وہاں بھی جُھک کر دیکھتا رہا اور پرے ہٹتے ہٹتے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ایک عورت آئی تھی

مجھے بتایا گیا کہ حمید کے تین دوست باہر موجود ہیں۔ میں نے ایک ایک کو اندر بلایا۔ ہر ایک نے حمید کے متعلق وہی کچھ بتایا جو مجھے پہلے ہی بتایا جا چکا تھا۔ کسی لڑکی کے ساتھ اُس کے مراسم نہیں تھے۔ کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔ ہندو پہلوانوں کے روّیے کے متعلق انہوں نے بتایا کہ وہ حمید

کو اپنا ایسا حریف سمجھتے تھے جو سب کو گرا دے گا۔

"کیا حمید غیر معمولی طور پہ طاقتور اور ماہر پہلوان ہے؟" — میں نے پوچھا۔

تینوں کا جواب ایک جیسا تھا۔ وہ اسے غیر معمولی طور پہ طاقتور نہیں سمجھتے تھے۔ ہندو بھی کوئی خاص پہلوان نہیں تھے۔ چونکہ اکھاڑے موجود تھے اس لئے کُشتیوں کا بھی رواج تھا۔ ہندوؤں کا اکھاڑہ الگ مسلمانوں کا الگ تھا۔ میں نے بھی حمید کو دیکھا تھا۔ اُس کے جسم کا معائنہ کیا تھا۔ اُس کا جسم گٹھا ہُوا تھا۔ میں نے اُس کے دوستوں سے پوچھا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا تھا؟ انہوں نے بتایا کہ اُٹھتا بیٹھتا تھا لیکن دوستی گہری نہیں تھی۔ میں نے ان سے بہت کچھ پوچھا لیکن مجھے کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ انہوں نے بتایا کہ حمید دلیر اور جرأت مند ہے۔

محلّے کے چوکیدار کو بلا کر پوچھا کہ اُس نے رات کسی کو مکان کے اندر جاتے یا باہر نکلتے دیکھا تھا؟ اُس نے صاف جواب دیا کہ اُس نے کسی کو نہیں دیکھا۔ چوکیدار اس اکیلے مکان کے پہرے پر تو نہیں تھا۔ اُسے سارے محلّے کی گشت کرنی تھی۔

کھوجی چھت سے درخت پر آگیا اور نیچے اُتر رہا تھا۔ میں درخت کے قریب چلا گیا۔

"ایک عورت اس درخت سے اُتر کر نیچے آئی ہے" — کھوجی نے کہا — "اُس نے جُوتی چھت پر اُتار دی تھی۔ جُوتی کے ساتھ درخت سے

اُترنا اور چڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ آئیے، آپ کو دکھاؤں۔"

اُس نے درخت سے پاؤں کے نشان دکھانے شروع کئے۔ یہ ننگے پاؤں کے نشان تھے جو درخت کے تنے سے برآمدے کی طرف جا رہے تھے۔ کھوجی نے مجھے اسی پاؤں کے کچھ اور کھُرے دکھائے جو اُلٹے تھے، یعنی وہ برآمدے سے درخت کی طرف جا رہے تھے۔ مٹی کچی تھی اس لئے کھُرے صاف تھے۔

"آپ دو چیزیں دیکھیں" — کھوجی نے کہا — "یہ جو کھُرے درخت سے برآمدے کی طرف جا رہے ہیں، ان کا درمیانی فاصلہ کم ہے۔ عورت آہستہ آہستہ، چوروں کی طرح جا رہی ہے، مگر واپسی کے کھُروں کا درمیانی فاصلہ زیادہ ہے۔ وہ واپس تیز چل کر جا رہی ہے یا دوڑ کر۔ کھُرے دوڑنے کی گواہی دیتے ہیں.... دوسری چیز یہ یاد کر لیں کہ اس عورت کے بائیں پاؤں کا تلوا زخمی ہے اور زخم سے خون نکل رہا ہے۔ آپ درخت سے برآمدے تک جانے والے کھُرے دیکھیں۔"

میں نے پاؤں کا ہر ایک نشان دیکھا۔ بائیں پاؤں کے ہر نشان کے اگلے حصے، یعنی اُنگلیوں سے ذرا پیچھے ایک نشان تھا۔ میں نے ایک سے اس جگہ سے چٹکی بھر مٹی اُٹھا کر سُونگھی۔ مجھے تازہ خون کی بُو آئی۔ میں نے تین چار کھُروں سے اس مقام کی مٹی اُٹھا کر محفوظ کر لی۔

"بُوٹ اتار دیں" — کھوجی نے کہا — "میں آپ کو درخت پر چڑھا کر چھت پر لے جا رہا ہوں۔ آپ کو دکھاؤں گا کہ اس کا پاؤں کہاں زخمی

ہُوا ہے۔"

عورت خُون بکھیرتی گئی

میں نے بُوٹ اُتار دیئے۔ اُس نے تنے کے پاس کھڑے ہو کر تنے پر ایک جگہ اُنگلی رکھی اور کہا کہ غور سے دیکھیں۔ میں نے وہاں لال رنگ کا ایک نشان دیکھا۔ اُس نے کہا کہ یہ عورت کے پاؤں کا خون ہے۔ پھر اُس نے مجھے کہا کہ اُوپر چڑھتے جائیے، آپ کو ایسے اور نشان ملیں گے۔ میں اُوپر چڑھتا گیا۔ مجھے تین جگہ ایسے نشان نظر آئے۔ میں ٹہن تک پہنچا تو کھوجی بھی تنے پر چڑھ آیا۔ کہنے لگا کہ اُوپر والے ٹہن کو پکڑ کر نیچے والے ٹہن پر منڈیر کی طرف چلتے جائیں اور نیچے والے ٹہن کو دیکھتے جائیں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ ٹہن پر جگہ جگہ خشک خون کے نشان تھے جو بڑے نہیں اور اتنے صاف بھی نہیں تھے کہ غور سے دیکھے بغیر نظر آ جاتے۔ انہیں کھوجی کی یا پولیس کی آنکھ ہی دیکھ سکتی تھی۔

کھوجی ٹہن پر آ گیا اور مجھے آگے چلنے کو کہا۔ میں اس کے نصف تک پہنچا تو کھوجی نے مجھے روک کر کہا — "ٹہن پر دیکھیں۔ وہاں سے ایک ٹہنی ٹوٹ کر گر چکی ہے" — میں نے دیکھا۔ ایک جگہ سے تقریباً دو انچ موٹی ٹہنی ٹوٹی تھی اور وہ جگہ خشک ہو گئی تھی یعنی وہاں سے ٹہنی کو ٹوٹے خاصا عرصہ گزر گیا تھا۔ وہاں ٹہنی کا کوئی ڈیڑھ ایک انچ ٹکڑا ایسا رہ گیا تھا

جو پنسل جتنا موٹا تھا اور اوپر سے کیل کی طرح نوکیلا ہو گیا تھا۔ یہ گول نہیں تھا۔ اس کے تین کونے تھے۔ میں نے اس کی نوک دیکھی۔ خون سے سُرخ تھی۔ میں نے ٹہن پر بیٹھ کر دیکھا۔ یہ خون ہی تھا، یا خون ہو سکتا تھا۔ مجھے یہ سیرالوجسٹ کے پاس بھیج کر رپورٹ لینی تھی کہ یہ خون انسانی ہے یا کسی جانور کا۔

کھوجی کے کہنے پر میں ٹہن پر آگے چلتا چھت پر چلا گیا۔ کھوجی بھی چھت پر آ گیا۔ چھت پر چونکہ سالہا سال سے لپائی نہیں ہوتی تھی اس لئے اس کی حالت وہی تھی جو دیہاتی علاقے کی کسی پگڈنڈی کی ہوتی ہے۔ مٹی اُکھڑی ہوتی تھی۔ وہاں سے سلیپروں کے نشان فصیل کی طرف جا رہے تھے۔ انہی میں گڈمڈ انہی سلیپروں کے نشان فصیل سے منڈیر تک آ رہے تھے۔

"عورت جُوتی اُتار کر درخت کے ذریعے نیچے گئی ہے"۔۔۔ کھوجی نے کہا۔۔۔ "واپس آ کر اُس نے پھر جُوتی پہنی اور چلی گئی۔ یہ نشان پُرانے نہیں۔ دس بارہ گھنٹے پہلے کے ہیں۔ ہوا نے ابھی ان پر مٹی نہیں ڈالی"۔

میں فصیل تک گیا جو اسی مکان کی تھی۔ جگہ جگہ سے اینٹیں گری ہوتی تھیں۔ اگلے مکان کی چھت اس مکان کی چھت جتنی اُونچی تھی لیکن اس پر تازہ لیپ تھا۔ میں کھوجی کے ساتھ اُس چھت پر گیا۔ کھوجی کو بھی کوئی نشان نظر نہ آیا۔ اُس نے کہا کہ وہ جو کوئی بھی تھی، اس چھت سے دبے پاؤں گزری ہے۔ اگر ننگے پاؤں ہوتی تو یہاں بھی خون کے

نشان ہوتے۔

یہ اسی گھر کی ہو سکتی تھی جس کی یہ چھت تھی۔ میں نے اس گھر کے آدمیوں کو اُوپر بُلایا۔ یہ مسلمانوں کا گھر تھا۔ آدمیوں میں ایک بوڑھا اور ایک لڑکا تھا۔ ایک بوڑھی عورت بھی آ گئی۔ اپنی چھت پر پولیس کو دیکھ کر وہ سب گھبرا گئے۔ میں نے انہیں تسلی دلاسہ دیا اور بوڑھے کو الگ لے جا کر کہا کہ میں تفتیش کر رہا ہوں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے صرف یہ بتا دے کہ اس گھر میں کتنی عورتیں ہیں۔

"یہی ایک عورت ہے"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "یہ میری بیوی ہے۔ میری بہو بھی ہے۔ وہ پندرہ سولہ دنوں سے اپنے میکے میں ہے۔ دو تین مہینے وہیں رہے گی کیونکہ اُس کا پہلا بچّہ پیدا ہونے والا ہے۔ اُس کے والدین نے کہا تھا کہ لڑکی پہلی زچگی اُن کے ہاں گزارے گی"۔

"رات تمہیں چھت پر کسی کے چلنے کی آواز نہیں سنائی دی؟"

"نہ جی!"۔۔۔ اُس نے جواب دیا اور اپنی بیوی اور لڑکے کو اپنے پاس بُلا کر پوچھا۔۔۔ "رات تم نے کسی وقت چھت پر کسی کے پاؤں کی آواز سُنی تھی؟"

دونوں نے بتایا کہ انہوں نے کوئی آواز نہیں سُنی۔ بوڑھے نے بہو کے متعلق جو کچھ بتایا تھا، اس کی تصدیق میرے لئے مشکل نہیں تھی۔ غریب سا یہ بوڑھا جھوٹ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ اس سے آگے ایک اور مکان تھا جس کی چھت اسی مکان کے برابر تھی۔ یہاں بھی تازہ لیپ تھا۔

ہم نے اس پر جاکر دیکھا۔ پاؤں کا کوئی نشان نہ ملا۔ یہ قدرے چھوٹا مکان تھا۔ اس گھر والوں کو بلایا تو ایک عورت اوپر آئی۔ میرے سامنے آکر اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس کی عمر تیس سال سے دو چار سال اوپر ہوگی۔ ابھی جوان تھی اور اس کی شکل وصورت اچھی تھی۔ رنگ نکھرا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ گھر میں اور کوئی عورت ہے؟ یا کوئی جوان لڑکی؟

"صرف میں ہوں اور میرا خاوند" — اس نے جواب دیا۔

"خاوند کہاں ہے؟"

"دکان پر!"

اس عورت نے شک گہرا کر دیا

مجھے اس عورت پر شک سا ہونے لگا۔ میں نے الگ لے جاکر اس کے دونوں پاؤں دیکھے۔ ان پر کوئی زخم نہیں تھا۔ کھوجی نے اس کا پاؤں غور سے دیکھا اور میری طرف دیکھ کر سر کا اشارہ کیا کہ یہ وہ پاؤں نہیں ہیں کھوجی کو اس کی جوتی دکھائی۔ اجڑے ہوئے مکان کی چھت پر اس جوتی کے نشان نہیں تھے۔ اس مکان سے آگے کوئی مکان نہیں تھا۔ خالی جگہ تھی اور اس مکان کا دروازہ خالی جگہ کی طرف تھا۔ دائیں اور بائیں طرف گلیاں تھیں۔ میں نے دونوں طرف منڈیر سے جھک کر دیکھا۔ سیڑھی کے بغیر اوپر چڑھنا ممکن نہیں تھا۔ کم از کم کوئی عورت ان دیواروں سے

نہیں چڑھ سکتی تھی۔ میں نے اس مکان کی سیڑھیاں دیکھیں۔ میں نیچے جاکر مکان دیکھنا چاہتا تھا لیکن اکیلی عورت کے ساتھ نیچے جانا مناسب نہ سمجھا۔

اس کے خاوند کو بلانے کے لئے ایک آدمی کو بھیجا اور اس عورت سے پوچھا کہ اس کے کتنے بچے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ایک بھی بچہ نہیں۔ شادی کو تیرہ چودہ سال گزر گئے تھے۔ اس سے یہ بھی پوچھا کہ اس نے رات چھت پر کسی کے چلنے کی آہٹیں سنی تھیں؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں سنیں۔

اس کا خاوند تھوڑی دیر بعد آگیا۔ میں اسے کچھ دیر تو دیکھتا ہی رہا۔ وہ چھوٹے ناٹے سے قد بت کا گول مٹول آدمی تھا۔ بڑھے ہوئے پیٹ اور موٹاپے نے اسے کارٹون بنا رکھا تھا۔ گردن تھی ہی نہیں۔ چہرہ فٹ بال کی طرح گول اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔ خوبصورتی بدصورتی اللہ کی دین ہے۔ میں اس شخص کے موٹے اور بھدے جسم پر طنز نہیں کروں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ شخص اس عورت کے قابل نہیں تھا۔ عورت کے جسم میں چہرہ مہرے کی طرح کشش تھی۔ اس جوڑ نے میرے دل میں عورت کے خلاف شک گہرا کر دیا۔

میرے سامنے آکر وہ بہت گھبرایا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے اس پر یا اس کی بیوی پر کوئی شک نہیں۔ ایک واردات کی تفتیش کر رہا ہوں۔ مجھے شک ہے کہ کوئی آدمی یا کوئی عورت اس چھت سے گزر کر اجڑے ہوئے مکان میں گئی ہے۔

میرے کہنے پر وہ مجھے نیچے لے گیا۔ میں نے مکان کے صحن اور

باہر والی دیوار اور سیڑھیوں کو غور سے دیکھا۔ عورت سے کہا کہ اپنی تمام جُوتیاں دکھائے۔ اُس نے تین جوڑے دکھائے۔ وہ سلیپر نہیں تھے جن کے نشان اُجڑے ہُوئے مکان کی چھت پر دیکھے گئے تھے۔ مجھے اس کے خاوند سے اس کے متعلق کچھ پوچھنا تھا مگر اس موقعہ پہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے دونوں کو پوری تسلّی دی کہ وہ ڈریں نہیں۔ ان کے خلاف کوئی شک نہیں، یہ صرف تفتیش ہے۔ میں نے دونوں کے ساتھ ذرا ہنسی مذاق کر کے اُن کی گھبراہٹ دور کر دی۔

چھتوں اور نیم کے درخت کے راستے ہم اُجڑے ہُوئے مکان میں آ گئے۔ میں نے ایک چھوٹی کلہاڑی منگوائی اور درخت پر چڑھ گیا۔ وہ نوکیلی لکڑی وہاں سے اکھاڑی اور ٹہن اور تنے پر جہاں جہاں خون کے نشان تھے وہاں سے چھلکے اُتار لئے۔ اس کے فوراً بعد سورج غروب ہو گیا۔ میں نے مکان پر ایک کانسٹیبل کا پہرہ لگا دیا اور محلّے کے تین معزّز افراد کو اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔ ہسپتال سے پھر وہی خبر آئی کہ حمید ابھی تک بے ہوش ہے۔ اُس کے پیٹ میں نلکی کے ذریعے دودھ ڈالا گیا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ ڈاکٹر اسے رات کی گاڑی سے پچیس میل دُور ضلعے کے سول ہسپتال میں بھیج رہا تھا۔

ایک راز، ایک خطرہ

میں نے معزّزین سے کہا ــــ "آپ سب کہتے ہیں کہ لڑکا شریف ہے

اور آپ اسے ہندوؤں کے مقابلے میں اکھاڑے کے لئے تیار کر رہے تھے۔ اس لڑکے پر کسی دشمن نے حملہ کیا ہے۔ میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ اس واردات میں کوئی ہندو لڑکی استعمال نہیں کی گئی۔ واردات والے مکان میں ایک لڑکی آئی تھی۔ ظاہر ہے یہ حمید کے لئے آئی تھی۔ اس لڑکی کے کسی بھائی یا باپ نے دیکھ لیا اور حمید کے سَر پہ ڈنڈا مارا۔ بھائی یا باپ نے وہیں یا گھر لے جا کر لڑکی کو ضرور مارا پیٹا ہو گا، لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہُوا کیونکہ لڑکی جدھر سے آئی تھی اُدھر کو اکیلی گئی۔ میں آپ کو ایک اشارہ یہ دیتا ہوں کہ اس لڑکی یا عورت کا بایاں پاؤں انگلیوں سے پیچھے یعنی پنجے سے زخمی ہے۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اُس نے پاؤں پہ پٹی باندھی ہے یا نہیں۔ پاؤں بہر حال زخمی ہے....

"میں گھر گھر جا کر ہر ایک عورت یا جوان لڑکی کے پاؤں نہیں دیکھ سکتا۔ یہ کام آپ اپنی خواتین سے کرا سکتے ہیں۔ آپ کی بیویاں ہیں، بہوئیں اور بیٹیاں ہیں۔ یہ سب دوسرے گھروں میں جاتی رہتی ہیں۔ انہیں اعتماد میں لے کر کہیں کہ وہ واردات والے مکان کے ارد گرد کے گھروں میں جائیں اور دیکھیں کہ کسی عورت کا بایاں پاؤں اس جگہ سے زخمی ہے جو میں نے آپ کو بتائی ہے؟ مجھے فوراً اطلاع دیں۔"

میں نے انہیں یہ بھی کہا ــــ "کوئی تھانیدار میری طرح کسی شہری کو تفتیش کے سلسلے میں یوں اعتماد میں نہیں لیا کرتا جس طرح میں نے آپ کو لیا ہے۔ آپ سب مسلمان ہیں اور حیثیت والے ہیں۔ مجھے اُمید ہے

کہ آپ میری مدد کریں گے۔ اگر آپ نے کچھ چھپانے کی کوشش کی تو آپ کو ایک نقصان تو یہ ہوگا کہ میں آپ کے خلاف شہادت چھپانے کے جُرم میں کارروائی کروں گا۔ دوسرا نقصان یہ کہ کل آپ میں سے کسی کے بیٹے یا بیٹی پر ایسا ہی حملہ ہوگا تو میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ اپنی خواتین سے بھی کہیں کہ یہ راز کسی کو نہ بتائیں جو میں بتا چکا ہوں۔ یہ سوچ لیں کہ میں نے آپ کو یہ راز دے کر کہ متعلقہ لڑکی یا عورت کا بایاں پاؤں زخمی ہے، یہ خطرہ مول لیا ہے کہ آپ میں سے کوئی صاحب ایسی لڑکی کو دیکھ کر اُسے شہر سے باہر بھیج دیں گے، لیکن یہ نہ بھولیں کہ مجھ سے راز لے کر آپ سب ایک خطرے میں آگئے ہیں۔ آپ اعانتِ جرم کے مجرم ہوں گے۔"

"آپ ہم پر اعتماد کریں۔"

"ہم پوری مخبری کریں گے۔"

"ہم ہندوؤں میں رہتے ہیں جی! ہم مسلمان تھانیدار کی پوری مدد کریں گے۔"

"ہمارا بس چلا تو ہم اس لڑکے کے دشمن کو باندھ کر آپ کے پاس لائیں گے۔"

سب نے مجھے تعاون اور رازداری کا یقین دلا دیا۔ میں نے اس مکان کو نظر انداز کر دیا تھا کہ حمید کو ہندوؤں نے لڑکی کا جھانسہ دے کے اس مکان میں بلایا اور اسے مارا ہے۔ یہ سامنے آگیا تھا کہ لڑکی چھت کی طرف سے نیم کے درخت کے ذریعے مکان میں آئی اور اسی راستے

سے واپس گئی۔ وہ ان دو مکانوں میں سے کسی ایک میں آئی اور اس کی سیڑھیوں سے اوپر گئی۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ یہ لڑکی ان مکانوں میں سے کسی ایک کے باہر سیڑھی لگا کر اُوپر گئی ہوگی۔ اُن دنوں آدھی رات کے بعد چاند نکلتا تھا اور چاندنی بڑی شفاف ہوتی تھی۔

جِنّ بولتا تھا

"مجھے ان دونوں گھرانوں کے متعلق بتائیں جو واردات والے مکان سے ملحق ہیں"۔۔۔ میں نے ان تین معززین سے پوچھا۔

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ انہوں نے بتایا کہ پہلا گھر جو بوڑھے اور بوڑھی کا ہے، وہ غریب اور شریف گھرانہ ہے۔ موٹے اور ناٹے خاوند اور اُس کی بیوی کے متعلق انہوں نے کوئی اچھی بات نہ کی۔ خاوند کی چھوٹی سی دکان تھی۔ وہ عقل کا بھی موٹا اور بیوی کے حضور میں دست بستہ کھڑا رہنے والا خاوند تھا۔ بیوی کے اشاروں پہ ناچتا تھا۔ بیوی کے متعلق ان معززین نے یہ تو نہ بتایا کہ بدچلن ہے یا کسی کے ساتھ اُس کی درپردہ دوستی ہے، اس قسم کی رائے دی کہ چالاک عورت ہے۔ چونکہ اُس کی اولاد نہیں اس لئے فارغ رہتی اور گھر گھر گھومتی پھرتی رہتی ہے۔ زندہ دل اور دلیر عورت ہے اور خاوند کا اس پر اختیار اور قابو نہیں۔

میری ساری باتیں سُن کر ان تینوں نے مجھے کہا کہ آپ پولیس اور قانون کی سوچ پر چل رہے ہیں مگر یہ نہ بھُولیں کہ مکان آسیب اور شرِ شرار والا ہے۔ میر صاحب نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ معلوم کر لیں گے کہ حمید اس مکان میں کیوں گیا تھا اور جنّات نے اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ میر صاحب نے ہمیں کہا تھا کہ ہم آپ کو روکیں، ورنہ خطرہ ہے کہ یہ جنّات بگڑ گئے تو آپ کو بھی اور محلّے والوں کو بھی پریشان کریں گے۔

"آپ میری مدد کریں تاکہ میں اپنی کارروائی کر کے اپنی ڈیوٹی پوری کر سکوں"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "میں انگریزوں کا ملازم ہوں جو جنّات کو نہیں مانتے اور جن کے سامنے میر صاحب کی کوئی حیثیت نہیں۔ میں میر صاحب سے ضرور مشورہ کروں گا۔ انہیں یہاں بلاؤں گا، لیکن میں نے آپ کے سپرد جو کام کیا ہے یہ ضرور کریں"۔

معزّزین کو فارغ کر کے مخبروں کو بلایا۔ انہیں بہت سی ہدایات دیں۔ حمید کے متعلق معلوم کرنا تھا کہ اس کی درپردہ دوستی کس لڑکی کے ساتھ ہے۔ یہ تو مجھے محلّے کے آدمیوں نے یقین کے ساتھ بتایا تھا کہ لڑکا شریف ہے مگر میں اب یہ تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ اس کی درپردہ زندگی میں کسی لڑکی کا دخل نہیں۔ مخبروں سے یہ بھی کہا کہ یہ ضرور معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ہندوؤں کے ساتھ حمید کی دوستی ہے یا دشمنی؟

دوسرے دن خون والی مٹی جو کھرّوں سے اُٹھائی تھی اور نیم کے درخت کے چھلکے اور لوکدار ٹکڑا اسیریا لوجسٹ کے نام پارسل کر دیا۔ دو

اڑھائی بجے ان معزّزین میں سے جنہیں میں نے رات اعتماد میں لیا تھا، ایک میرے پاس تھانے میں آیا اور مجھے بتایا کہ محلے میں ایک جوان، خوبصورت اور غیر شادی شدہ لڑکی ہے۔ اسے کوئی دو ماہ سے گھوٹ یا پکڑ کا دَورہ پڑتا ہے۔ عامل (میر صاحب) نے کہا ہے کہ یہ جنّ ہے۔ اُسے تیسرے چوتھے روز دَورہ پڑتا ہے۔ میر صاحب کو بُلا لیا جاتا ہے۔ جنّ اُن کے ساتھ باتیں کرتا ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ جنّ باتیں اس طرح کیا کرتا ہے کہ جنّ جس انسان میں داخل ہوتا ہے، وہ انسان بولتا ہے۔ یہ انسان اس طرح باتیں کرتا ہے ۔۔۔ "اس نے ہماری بے ادبی کی ہے، میں اسے نہیں چھوڑوں گا"۔۔۔ وغیرہ۔

اس آدمی نے بتایا کہ یہ جنّ میر صاحب کے قابو میں نہیں آ رہا۔ وہ پندرہ بیس منٹ لڑکی پر قبضہ رکھتا ہے اور بڑی اچھی باتیں کرتا ہے۔ اُس سے مستقبل کی کوئی بات پوچھو تو بالکل صحیح بتاتا ہے۔ وہ سب کے نام بھی جانتا ہے۔ عورتیں اُس کے پاس آئندہ کی باتیں پوچھنے جاتی ہیں۔

"آج صبح میری بیوی اس لڑکی کے گھر گئی تو لڑکی گھر کے کام کاج میں لگی ہوئی تھی"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "میں نے بیوی سے کہا تھا کہ دوسرے گھروں میں جا کر دیکھے کہ کسی عورت یا لڑکی کا پاؤں زخمی ہو گا۔ میری بیوی نے مجھے بتایا کہ اس لڑکی نے بائیں پاؤں پر پنجے کے قریب پٹی باندھ رکھی تھی۔ میری بیوی نے اُس سے پوچھا کہ پاؤں کو کیا ہوا ہے؟ اُس کی ماں نے جواب دیا کہ کل صبح بہت سویرے اُٹھ کر ننگے پاؤں صحن میں چلی گئی۔ ایک

کیل اس کے پاؤں میں اُتر گئی۔"

"آپ کو یہ تو معلوم نہیں ہوگا کہ عامل دورے کی حالت میں کیا کرتا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"عورتیں بتاتی ہیں کہ لڑکی جس کمرے میں ہوتی ہے اس سے سب کو باہر نکال دیتا ہے" — اس نے جواب دیا — "اور دروازہ بند کر لیتا ہے۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھولتا ہے، پھر سب کو اُس کے ساتھ باتیں کرنے کی اجازت دیتا ہے۔"

"اس لڑکی کی کہاں منگنی ہو گئی ہے؟" — میں نے پوچھا اور کہا — "آپ کو شاید معلوم نہ ہو۔"

"ہر گھر کی ذرا ذرا سی بات پورے محلے کو معلوم ہوتی ہے" — اُس نے کہا — "اُس کی منگنی ہو چکی ہے۔"

"دورے اس کے بعد شروع ہوتے ہیں؟"

"یہ میں آپ کو پوچھ کر بتاؤں گا" — اُس نے جواب دیا — "میرا خیال ہے کہ دورے بعد میں شروع ہوتے ہیں۔ میری بیوی اور بیٹی افسوس کیا کرتی ہیں کہ ان دوروں کی وجہ سے لڑکی کی منگنی ٹوٹ جائے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ ایسے خطرناک روگ والی لڑکی کو کون قبول کرتا ہے۔"

"آپ لڑکے کو تو نہیں جانتے ہوں گے جس کے ساتھ منگنی ہوتی ہے"

"وہ ان کی قریبی رشتہ داری کا لڑکا ہے" — اُس نے کہا — "ہمارے محلے میں رہتا ہے۔"

"کیسا ہے؟"

"لڑکی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں" — اُس نے جواب دیا — "لڑکی خوبصورت ہے اور لڑکا مریل سا اور سانولے رنگ کا ہے۔ ویسے بھی ڈھیلا ڈھالا سا ہے۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ کوئی جوڑ نہیں۔"

"بالکل نہیں جی!" — اُس نے کہا — "لیکن اُن کی برادری میں اور کوئی لڑکا جوان نہیں اور یہ لوگ برادری سے باہر لڑکی دیتے نہیں۔"

میں نے لڑکی دیکھی

میں نے ایسی دو چار کہانیاں سُنی تھیں جن میں خوبصورت لڑکی، بدصورت منگیتر، دوروں اور عامل کا ذکر تھا۔ ایسی لڑکی میں داخل ہونے والا جن یہ کہا کرتا ہے کہ اگر اس لڑکے نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کی تو میں لڑکے کا کلیجہ مُنہ کے راستے نکال دوں گا۔ اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ لڑکے والے منگنی توڑ دیتے ہیں۔

مجھے میر صاحب عامل کی باتیں یاد آنے لگیں جو اُس نے ایک روز پہلے مجھ سے کی تھیں۔ اُس نے کہا تھا کہ حمید کو کوئی جن یہاں لے آیا۔ جن لڑکی کے روپ میں تھا۔ حمید لڑکی کی طرف چلا تو اُس کے سر پر چوٹ پڑی۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کسی جن کو گرفتار نہیں کر سکتے، یہ کام مجھے

کرنے دیں، میں اس جنّ کو حاضر بھی کر دوں گا.... میں نے اُس کی ہر بات ذہن میں تازہ کی۔ بات کرنے کا انداز یاد کیا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ میں تفتیش ترک کر دوں۔ میں اِن عاملوں، شاہ صاحبوں اور جنّ نکالنے والوں کی اصلیّت سے آگاہ تھا۔ آج بھی دیہاتی علاقوں میں ہسٹیریا اور مرگی کو یہ لوگ جنّ اور شر شرار کہتے ہیں اور لوگوں کو پسماندگی اور جہالت میں رکھ کر نہ صرف اُن کے گاڑھے پسینے کی کمائی لوٹتے ہیں بلکہ ان کی سیدھی سادی خواتین کی عزّت کے ساتھ کھیلتے ہیں۔

میری سمجھ میں ابھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ لڑکی واردات والے مکان میں گئی تھی تو کیوں گئی تھی۔ کیا حمید سے ملنے گئی تھی؟ کیا وہ حمید کو چاہتی ہے؟ یہ مجھے نظر آنے لگا تھا کہ اُسے دَورے جو پڑتے ہیں یہ منگنی تڑوانے کا ایک بہانہ ہے اور عامل اس ڈرامے میں شامل ہے۔ مگر حمید کے سر پر ضرب کس نے لگائی؟ کیا یہ کوئی رقیب تھا؟ کیا یہ اس لڑکی کا منگیتر تھا؟ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ ضرب لگانے والا کوئی جنّ ہی نہ ہو۔ میں نے اس قسم کی باتیں بھی سُنی تھیں کہ ایک آدمی غلطی سے کسی آسیب زدہ جگہ چلا گیا تو اُس کے مُنہ پر بڑے زور کا تھپڑ پڑا، یا اُسے ایسا دھکا لگا کہ اوندھے مُنہ گرا۔

لڑکی کا زخمی پاؤں مجھے شک میں ڈال رہا تھا۔ میرے پاس اِس کا تو کوئی ثبوت نہیں تھا کہ اس کا پاؤں نیم کے درخت سے اُترتے زخمی ہُوا ہے۔ لڑکی کے پاؤں کے نشان دیکھنے تھے۔ مجھے تفتیش کرنی تھی

سوچ سوچ کر میں نے کھوجی کو بُلایا۔ وہ میرے کہنے پر علی الصبح تھانے میں آ گیا تھا۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ تفتیش ختم ہونے تک سارا دن تھانے میں رہا کرے۔ اُسے کہا کہ ایک لڑکی کے پاؤں اور اُس کی جُوتی دیکھنی ہے لیکن اُسے اور اُس کے گھر والوں کو پتہ نہ چلے کہ ہم تفتیش کر رہے ہیں۔ کھوجی کو میں نے سب کچھ سمجھا دیا۔

میں نے وردی اُتار کر پرائیویٹ کپڑے پہنے اور کھوجی کو ساتھ لے کر لڑکی کے گھر چلا گیا۔ اُس کا گھر اُس مکان سے ذرا سا ہی دُور تھا جہاں موٹا خاوند اور اُس کی خوبصورت بیوی رہتی تھی۔ لڑکی کے باپ نے مجھے پہچان لیا۔ خوش قسمتی سے کھوجی کو نہ پہچان سکا۔ وہ ڈر گیا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں تھانیدار کی حیثیت سے نہیں آیا، بلکہ میں یہ سُن کر آیا ہوں کہ لڑکی کے پاس جب جنّ آتا ہے تو غیب کی باتیں بتاتا ہے۔ میں اُس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔

"وہ دَورے کے دوران بتاتی ہے" ـــ باپ نے کہا اور اُس کے آنسو نکل آتے۔ کہنے لگا ـــ "لڑکی کی منگنی ہو چکی تھی لیکن اس مصیبت نے منگنی کھٹائی میں ڈال دی ہے۔ میں منگنی کر کے بہت خوش تھا کہ یہ فرض ادا ہو گیا ہے مگر لڑکے والے دو مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ وہ منگنی توڑ دیں گے۔ میں اُن کی مِنّت سماجت کر کے کہتا ہوں کہ میر صاحب نے یقین دلایا ہے کہ جنّ جلدی نکل جائے گا اور پھر کبھی نہیں آئے گا۔"

"میر صاحب نے کبھی آپ کے ساتھ منگنی قائم رکھنے یا توڑنے کی

"بات کی ہے؟" — میں نے ایک شک کی بنا پر یہ سوال کیا۔
"وہ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ منگنی توڑنی پڑے گی" — اُس نے جواب دیا — "میر صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ تمہاری بیٹی بہت خوبصورت ہے اور یہ جن اس پر عاشق ہو گیا ہے۔ چونکہ جن اور انسان کی شادی نہیں ہو سکتی اس لئے جن لڑکی کی شادی اپنی پسند کے لڑکے کے ساتھ کرائے گا۔ جن کو یہ لڑکا پسند نہیں جس کے ساتھ لڑکی کی منگنی کی گئی ہے .... لیکن صاحب! برادری کا معاملہ ہے۔ منگنی ٹوٹ گئی تو میں دوسرا لڑکا کہاں سے لاؤں گا۔"
"دَورے منگنی سے پہلے شروع ہوتے تھے یا بعد میں؟"
"منگنی سے کوئی ایک ہفتہ بعد۔"

جن کی شناخت ہو گئی

میں نے کھوجی کے متعلق اُسے کہا — "یہ میرے دوست ہیں۔ میر نے انہیں بتایا کہ یہاں ایک لڑکی پر ایک جن آتا تھا جو غیب کی باتیں بتاتا ہے۔ یہ جن سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جنات کو حاضر کرتے ہیں اور جن نکالتے بھی ہیں۔ آپ لڑکی کو بلائیں۔"
مصیبت کا مارا باپ اپنی بیٹی کو لے آیا۔ لڑکی واقعی خوبصورت تھی۔ اُس کے بائیں پاؤں پر دو انچ چوڑا کپڑا بندھا تھا اور اُس نے

سلیپر پہن رکھے تھے۔ کھوجی نے بڑی اچھی اداکاری کی۔ لڑکی کو سامنے بٹھا کر کچھ پڑھا پھر اس کی آنکھیں اپنی انگلیوں سے کھول کر پھونکیں ماریں اور کہا — "پاؤں کا چکر ہے۔"
"ایک مٹھی مٹی یا ریت لے آئیں" — کھوجی نے لڑکی کے باپ سے کہا۔
باپ دوڑا گیا اور باہر سے مٹی اُٹھا لایا۔ کھوجی نے مٹی فرش پر رکھ کر پھیلائی اور اسے ہموار کیا، پھر لڑکی سے کہا — "سلیپر سمیت پاؤں مٹی پر رکھو" — لڑکی نے پاؤں رکھا اور کھوجی کے کہنے پر پاؤں اُٹھا لیا۔ کھوجی نے مٹی کو غور سے دیکھا پھر مٹی پر ہاتھ پھیر کر لڑکی سے کہا — "اب سلیپر اُتار کر پاؤں مٹی پر رکھو" — لڑکی نے ایسا ہی کیا۔ کھوجی نے پھر مٹی کو غور سے دیکھا۔ کھوجیوں میں یہ وصف ہوتا ہے کہ ایک کھُرے کو بڑے لمبے عرصے تک یاد رکھتے ہیں۔
اُس نے میری طرف دیکھا۔ ذرا سا مسکرایا اور سر کا اشارہ کر کے بولا — "ٹھیک ہو جاتے گی ملک صاحب!"
میں اشارہ سمجھ گیا۔ میں نے لڑکی کے باپ سے کہا — "اب لڑکی کو دَورہ پڑے تو مجھے اطلاع دینا۔ میں انہیں (کھوجی کو) لے کر آجاؤں گا۔ میرا خیال ہے یہ جن میر صاحب کے قبضے میں نہیں۔"
"میں نے اس جن کو پہچان لیا ہے" — کھوجی نے کہا — "نکل جاتے گا۔"

باہر آکر کھوجی نے کہا ——— "مکان میں اور چھت پر اسی لڑکی کے کھُرے تھے۔ اب یہ آپ معلوم کریں کہ یہ وہاں کیا لینے گئی تھی۔"

میں نے تھانے میں جاکر ایک کانسٹیبل کو بھیجا کہ عامل کو بلا لائے۔

عامل کو آنے میں دیر نہ لگی۔ وہ ایسے انداز سے آیا جیسے میرا پیر و مرشد ہو۔ اُس کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور کوئی وِرد کر رہا تھا۔ میرے دفتر میں آکر مجھ پر پھونک ماری، پھر ایک ہی جگہ گھوم کر کمرے میں ہر طرف پھونکیں ماریں۔ میرے کہنے پر وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور وِرد جاری رکھا۔

"میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں" ——— میں نے کہا۔

اُس نے وِرد جاری رکھا۔ اُس کے ہونٹ ہلتے رہے اور اس نے سر کے اشارے سے مجھے بتایا کہ ذرا انتظار کرو۔۔۔ میں انتظار کرتا رہا۔ دو تین منٹ بعد اُس نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے پھر ہاتھ منہ پر پھیر کر بولا ——— "یہ میرے لئے بہت ضروری ہے۔ جنّات میں بعض شیطان ہوتے ہیں۔ اکثر میرے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔"

اُس نے تسبیح، وِرد، پھونکوں اور دعا سے جو تاثر پیدا کر دیا تھا اسے نظر انداز کرنے کے لئے لوہے کے اعصاب بلکہ لوہے سے زیادہ مضبوط ایمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے لوگ علم سے بے بہرہ اور جذباتی ہوتے ہیں اس لئے وہ اس تاثر کو فوراً قبول کر کے ہپناٹائز ہو جاتے ہیں۔

میں نے بھی میر صاحب سے بات کرنے میں جھجک سی محسوس کی لیکن میں نے یہ سوچ لیا کہ مجھے تفتیش کا فرض ادا کرنا ہے ورنہ نوکری سے ہاتھ دھونے

پڑیں گے۔ اس کے علاوہ میرے دل میں کچھ شکوک بھی تھے۔ میر صاحب عامل نے معلوم نہیں کیا وِرد و وظیفہ کیا تھا، میں نے دل ہی دل میں تین دفعہ پڑھا اللّٰہ نُورُ السّمٰوات والارض۔

"میر صاحب!" ——— میں نے پوچھا ——— "وہ لڑکی منگنی تڑوا کر کس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے؟"

میں نے نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ مجھے اُس کے چہرے کا مطالعہ کرنا تھا۔ یہ ایک پیچیدہ فن تھا جس کی مجھے مہارت دکھائی تھی۔ میں نے اُس کے چہرے پر ہلکی سی تبدیلی دیکھی جسے اُس نے اپنے اُوپر وجدانی سی کیفیت طاری کر کے چھپانے کی کوشش کی۔

"یہ حضرت سلیمانؑ کی اُمّت کے راز ہیں" ——— اُس نے جواب دیا ——— "یہ راز مجھے معلوم ہو جاتے ہیں۔"

"لڑکی پر جو جن فریفتہ ہو گیا ہے، یہ واردات والے مکان میں رہتا ہے؟" ——— میں نے پوچھا۔

"یہ بھی ایک راز ہے" ——— اُس نے آنکھوں میں خمار کا تاثر پیدا کرتے ہوئے کہا ——— "کسی وقت یہ بھی بتا دیں گے۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ یہ جن مستقبل اور غیب کی باتیں بتاتا ہے؟"

"بالکل بتاتا ہے" ——— اُس نے جواب دیا۔

"یہ بتائے گا کہ حمید اس مکان میں کیوں گیا تھا اور اُس کے سر پر ڈنڈا کس نے مارا تھا؟"

"آپ نے میری بات مانی نہیں" — اُس نے کہا — "یہ تو میں بھی آپ کو بتا سکتا ہوں۔ آپ اپنی تفتیش بند کر دیں۔ جنّات ناراض ہوتے ہیں۔"

میں کرسی سے اُٹھا اور اُس کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر آہستہ سے اس کا مُنہ اپنی طرف کیا۔

"میر صاحب!" — میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا — "آپ اس لڑکی سے معاوضہ نقد لے رہے ہیں یا کسی اور صورت میں؟"

وہ چونکا اور اُس نے مجھ سے آنکھیں چُرانے کی کوشش کی۔

"میر صاحب!" — میں نے کہا — "آپ تھانے میں ایک تھانیدار کے سامنے بیٹھے ہیں۔ کوئی جِنّ آپ کو مجھ سے چھُڑانے نہیں آئے گا۔ اگر آپ جِنّ حاضر کر سکتے ہیں تو یہاں ایک جِنّ حاضر کریں جو میرے سر پر ڈنڈہ مار کر آپ کو یہاں سے اُٹھا لے جائے۔"

"آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں جناب!" — اُس نے کھسیانہ سا ہو کر کہا — "مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔"

"میں بڑی صاف قسم کی باتیں کر رہا ہوں جناب!" — میں نے اُسے کہا — "دوستوں کی طرح سمجھنے کی کوشش کریں گے تو جناب کی سمجھ میں آ جائیں گی۔ اگر جناب ہیرا پھیری کریں گے تو میں پولیس کا خاص طریقہ اختیار کروں گا۔ بڑے بڑے ڈاکو بھی یہاں بول پڑتے ہیں، آپ تو کچھ بھی نہیں۔ پانچ منٹ میں آپ کے اندر کا جِنّ بھاگ جائے گا اور آپ میرے

قدموں میں سر رکھ دیں گے۔"

"آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں جناب!" — اُس نے کہا اور اب اُس کی گھبراہٹ نمایاں ہو گئی تھی۔

"میں نے آپ کو بالکل صحیح سمجھ کر بلایا ہے" — میں نے کہا — "آپ بہت بڑے مُجرم ہیں۔ میرے مذہب کے بھی مُجرم، ملک کے قانون کے بھی مُجرم.... دیکھو، میں آپ کا احترام کر رہا ہوں۔ شرافت سے بتا دو کہ لڑکی حمید کو چاہتی ہے؟"

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔

"وہ اُس مریل اور کالے کلوٹے سے منگیتر سے منگنی تڑوانا چاہتی ہے نا؟" — میں نے اُسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

جِنّ مان گیا

وہ خاموش رہا۔ میں نے زور سے ہاتھ مار کر اُس کی پگڑی اُتار دی۔ اُس کے بال کندھوں تک لمبے تھے۔ میں نے سر پر ہاتھ رکھ کر اُس کے بال مُٹھی میں لئے اور اُٹھ کر بال اتنی زور سے کھینچے کہ وہ درد سے دانت پیستا اُٹھا۔

"میں تمہیں اسی طرح بازار اور گلیوں میں گھسیٹوں گا" — میں نے کہا — "جن لوگوں میں تم میر صاحب بنے ہوتے ہو، اُن کے درمیان بٹھا

کر تمہاری اصلیت دکھاؤں گا۔"

مجھے اس شخص پر بہت غصہ تھا۔ یہ اللہ کا کلام پڑھ کر فریب کاری کر رہا تھا۔ میں ملک کے ہر ایک عامل اور پیر کے خلاف تو کچھ نہیں کر سکتا تھا یہ میرے ہاتھ آگیا تھا۔ اسے میں اپنے ہاتھوں سزا دینا چاہتا تھا۔

"یہ نہیں بتاؤ گے یا دوسرے کمرے میں لے چلوں؟" — میں نے اس کے بال اور زور سے کھینچے اور کہا — "اس کمرے سے نکلو گے تو آئینے میں اپنی صورت نہیں پہچان سکو گے۔"

"آپ مجھے بدنام تو نہیں ہونے دیں گے؟" — اس نے التجا کے لہجے میں پوچھا۔

"اگر سچ بولو گے تو تمہاری عزت قائم رہے گی" — میں نے جھوٹا وعدہ کیا۔

"یہ لڑکی حمید کو نہیں چاہتی" — اس نے کہا — "اس لڑکے کا نام اسلم ہے جسے وہ پسند کرتی ہے۔"

اس شخص نے صاف الفاظ میں بتا دیا کہ ایک عورت نے اسے اس لڑکی کے متعلق کہا تھا کہ لڑکی کی منگنی ایسے لڑکے کے ساتھ ہو گئی ہے جو اسے بہت برا لگتا ہے اور وہ کسی اور کو چاہتی ہے۔ یہ مجھے اس عامل سے پتہ چلا کہ یہ تعویذ دیتا اور ٹونے بھی کرتا تھا۔ لڑکی اس سے کوئی ایسا ٹونا یا جادو کرانا چاہتی تھی جس سے منگنی ٹوٹ جائے اور اس کی پسند کے لڑکے کے ساتھ شادی ہو جائے۔ عامل نے اس عورت سے کہا کہ وہ لڑکی سے کہے

کہ اپنے اوپر پکڑ کی کیفیت طاری کر لے۔ اس نے عورت سے یہ بھی کہا کہ وہ لڑکی کو اپنے گھر بلا لے تاکہ عامل اسے ٹریننگ دے دے کہ یہ کیفیت کس طرح طاری کی جاتی ہے۔

یہ وہی عورت تھی جس کا خاوند موٹا بھدا اور گول مٹول تھا۔ اس کا گھر واردات والے مکان سے دوسرا تھا جہاں میں گیا تھا۔ یہ عورت پہلے روز ہی مجھے مشکوک نظر آئی تھی۔ عامل میر صاحب نے مجھے بتایا کہ عورت کھلاڑی ہے۔ دل جوڑنے اور توڑنے کی ماہر ہے۔ یہ اس کا مشغلہ ہے اور پیسے کمانے کا ذریعہ بھی۔ اس کا خاوند صبح سویرے دکان پر چلا جاتا اور شام کے بعد گھر آتا تھا۔ پیچھے یہ عورت گھر میں اکیلی رہتی اور اس کا ذہن شیطان کی ورکشاپ بنا رہتا تھا۔ اس نے عامل اور لڑکی کو اپنے گھر میں اکٹھا کر لیا۔ عامل نے لڑکی کو ٹریننگ دے دی اور مشق بھی کرائی۔

لڑکی کے والدین خوشحال تھے۔ اس نے گھر سے چراتے ہوئے پیسے عامل اور اس عورت کو دیئے اور عامل سے بھی اس عورت نے کمیشن وصول کی۔ لڑکی نے اپنے گھر جاتے ہی عامل کی کرائی ہوئی ریہرسل کے مطابق اپنے آپ پر ہسٹیریا جیسی کیفیت طاری کر لی۔ ہاتھ پیچھے کو موڑ لئے۔ آنکھیں بہت زیادہ کھول لیں اور غرّاتے لہجے میں بولنے لگی — "اسے نہیں چھوڑوں گا۔ سارے خاندان کو تباہ کر دوں گا۔"

اس کے گھر والے ڈر گئے۔ فوراً میر صاحب کو بلایا۔ اس نے جا کر اپنا عمل کیا اور گھر والوں کو بتایا کہ لڑکی پر جن کا قبضہ ہو گیا ہے پھر تیسرے

چوتھے روز لڑکی اور عامل یہ ناٹک کھیلنے لگے۔ لڑکی چونکہ محلّے کی ہر عورت کو جانتی تھی، اس لئے "دَورے" کے دوران جو عورت اسے دیکھنے آتی، لڑکی اُس کا نام لے کر اُس کے گھر کے حالات بتاتی۔ میر صاحب 'دَورے' کے دوران کمرے میں سے سب کو باہر نکال کر دروازہ بند کر لیتا اور کچھ وقت لڑکی کے ساتھ تنہا گزارتا۔ اُس نے لڑکی کے والدین کو بتا دیا کہ لڑکی پر یہ جن عاشق ہو گیا ہے اور وہ لڑکی کی شادی اپنی پسند کے آدمی سے کرائے گا۔ عامل نے لڑکی کے منگیتر کے والدین سے بھی کہہ دیا تھا کہ انہیں منگنی توڑنی پڑے گی ورنہ ان کے بیٹے کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔

لوگ انسانوں پر جنات کے قبضے کو مانتے تھے اور میر صاحب کی کرامات کے بھی قائل تھے، اس لئے کسی نے بھی شک نہ کیا کہ یہ ناٹک کھیلا جا رہا ہے۔ میر صاحب لڑکی کے گھر سے نقد بھی وصول کرتا رہا اور خاطر و مدارات بھی کراتا رہا اور لڑکی اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے اسے الگ پیسے دیتی تھی۔ اُس نے میر صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ اُس کی شادی اُس کی پسند کے مطابق ہو گئی تو وہ اسے انعام دے گی جس میں زیورات میں سے بھی ایک چیز ہو گی۔ اب انہیں جن کی زبان سے یہ کہنا تھا کہ لڑکی کی شادی فلاں لڑکے سے کی جائے۔

میں نے اُس کی یہ کہانی سُن کر پوچھا کہ حمید کا اس لڑکی کے ساتھ کیا تعلق ہے اور اُس پر کس نے حملہ کیا اور کیوں کیا ہے۔

"اس کے متعلق مجھے کچھ بھی معلوم نہیں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔

"لڑکی نے اس کا کبھی نام بھی نہیں لیا تھا۔ میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ جس لڑکے کو وہ چاہتی ہے، اُس کا نام اسلم ہے۔ ہو سکتا ہے اسلم اور حمید کی آپس میں رقابت ہو"۔

میرا مسئلہ جُوں کا تُوں رہا۔ مجھے تو واردات کے متعلق ہی معلوم کرنا تھا۔ میر صاحب کے انکار کو میں نے اس لئے قبول کر لیا کہ اُس نے اپنا آپ بے نقاب کر دیا تھا، واردات کے متعلق اسے واقعی کچھ بھی معلوم نہیں ہو گا۔

"لڑکی اسلم سے ملتی ہو گی"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"ملتی ہو گی لیکن مجھے معلوم نہیں کہاں ملتی ہے"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

وہی عورت وہی سیڑھیاں

میں نے اُسے تھانے میں بٹھائے رکھا اور اُس سے اسلم کا گھر معلوم کر کے ایک کانسٹیبل کو اُسے بلا لانے کو بھیجا۔ ایک اور کانسٹیبل کو موٹے ناٹے کی بیوی کو تھانے لانے کو بھیجا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے دونوں آ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور دونوں نے میر صاحب کو بھی تھانے میں بیٹھے دیکھ لیا۔ میں نے عورت کو آسان شکار سمجھ کر اندر بلا لیا۔

"تم نے میر صاحب کو اور اسلم کو تھانے میں دیکھ لیا ہے"۔۔۔ میں نے اُسے کہا۔۔۔ "تم عورت ذات ہو اور تھانے میں ہو۔ جھوٹ بولو گی

تو تمہاری اتنی بے عزّتی ہو گی جو تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ میر صاحب سب کچھ
بتا چکا ہے۔ اسی کی نشاندہی پر تمہیں اور اسلم کو بلایا ہے۔ اپنی زبان سے
بتا دو۔"

اُس نے مجھے زیادہ پریشان نہ کیا۔ میر صاحب نے جو اقبالی بیان
دیا تھا وہی اس نے سُنا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ میر صاحب سے کیا انعام
لیتی تھی، بلکہ وہ اس شخص کو بلیک میل بھی کرتی رہی تھی۔ اُس نے نئی بات
یہ بتائی کہ اسلم اور لڑکی کے درمیان وہ رابطے کا کام کرتی تھی۔ ان دونوں
کی ملاقاتیں بہت ہی کم ہوتی تھیں۔ لڑکی اسلم کے گھر اُس کی بہن کے
پاس جاتی تھی اور بہن چونکہ دونوں کی محبت سے واقف تھی، اس لئے
اِدھر اُدھر ہو جایا کرتی اور وہ دونوں چند منٹ اکٹھے بیٹھ لیتے تھے۔ پیا
رسانی کا کام یہ عورت کرتی اور اسلم سے پیسے لیا کرتی تھی۔

اسلم اس عورت کے پیچھے پڑا رہتا تھا کہ وہ لڑکی کو اپنے گھر بلا
اور وہ آجائے گا۔ عورت ایسا کرنے سے ڈرتی تھی۔ محلّے میں ہر کوئی
تھا اور دن کے وقت اس کے گھر عورتوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ رات
اُس کا خاوند گھر ہوتا تھا۔ لڑکی کی بھی یہی فرمائش ہوتی تھی۔ اللہ جب
گناہگاروں کو گرفت میں لینے کا حکم دیتا ہے تو گناہگاروں کی عقل پر
پڑ جاتا ہے۔ عورت نے دونوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اس اُجڑے ہوئے
مکان میں رات کو ملیں۔ وقت صبح کی اذان سے کچھ پہلے کا رکھا گیا کیونکہ
وقت چوکیدار چلے جاتے ہیں اور سب گہری نیند سوتے ہوتے ہیں۔

اسلم کو مکان میں دروازے کی طرف سے داخل ہونا تھا۔ لڑکی کو عورت
نے بتایا کہ وہ اُس کے گھر دبے پاؤں آجائے۔ اُسے دروازہ کھُلا ملے گا۔
اپنے خاوند کے متعلق اُس نے بتایا کہ اس وقت گہری نیند سویا ہوا ہوتا
ہے۔ عورت نے لڑکی کو مکان میں اُترنے کا یہ راستہ بتایا کہ اس کے
مکان کی سیڑھیوں سے اُوپر جاتے اور چھتوں سے دبے پاؤں گزر کر
واردات والے مکان کی اُس چھت تک جاتے جہاں نیم کے درخت کا ٹہن
چھت پر آیا ہُوا تھا۔

میرے پوچھنے پر اس عورت نے بتایا کہ اس راستے وہ پہلے دو
لڑکیوں کو اس مکان میں اتار چکی تھی اور یہ ملاقاتیں کامیاب رہی تھیں۔
پروگرام کے مطابق لڑکی آگئی۔ عورت نے اس سے ذرا دیر پہلے اپنے مکان
کے دروازے کی زنجیر کھول دی تھی۔ اس نے لڑکی کو چھت پر چڑھا دیا۔
وہ خود اپنی چھت پر کھڑی رہی۔ لڑکی گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد گھبراتی ہوئی
واپس آئی۔ عورت نے اس سے پوچھا کہ اسلم آیا تھا؟ لڑکی جواب دیئے بغیر
اس کی سیڑھیاں اُتر گئی۔ صبح محلّے میں شور اُٹھا کہ اُجڑے ہوئے مکان میں
ایک آدمی پڑا ہے۔ کوئی کہتا تھا بیہوش ہے، کوئی کہتا لاش ہے۔ بعد
میں پتہ چلا کہ حمید تھا۔

"تم نے اس لڑکی کے ہاں جا کر اس سے پوچھا ہو گا کہ مکان میں کیا
ہُوا تھا؟"

"میں گئی تھی" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "لڑکی نے مجھ سے پوچھا کہ

تمہیں یقین ہے کہ مکان میں حمید پڑا تھا؟ اسلم تو نہیں تھا؟ ..... میں نے اُسے بتایا کہ لوگ حمید کا نام لے رہے ہیں۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہاں کیا ہُوا تھا تو اُس نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا کہ وہاں کوئی اور آدمی تھا، میں اُسے دیکھ کر بھاگ آئی تھی۔ پھر وہ میری منّت سماجت کرنے لگی کہ میں کسی سے بات نہ کروں۔"

عامل کا کالا ڈنڈہ

اس عورت سے کچھ اور باتیں پوچھ کر اسے الگ کمرے میں بٹھا دیا۔ اسلم کو بلایا۔ اُس کی گھبراہٹ کا تو یہ حال تھا کہ صاف نظر آرہا تھا کہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا ہے۔ اُس کا مُنہ کھلا ہُوا تھا اور ہونٹ بھی کانپ رہے تھے۔ اگر میں ذرا سی رعب دار آواز میں بولتا تو وہ بیہوش ہو کر گر پڑتا۔ اسے نارمل حالت میں لانے کے لئے میں ہنس پڑا اور اُسے کہا — "اسلم! میں انسان ہوں۔ تم تو یُوں ڈر رہے ہو جیسے میں کوئی جن بھوت ہُوں۔ میں نے تمہیں گرفتار تو نہیں کر لیا۔ بیٹھ جاؤ اور ہوش ٹھکانے رکھو۔ مسلمان نوجوان کو اتنا بُزدل نہیں ہونا چاہیئے۔ کوئی ایسی ویسی حرکت اگر تم سے ہو بھی گئی ہے تو میں سنبھال لوں گا۔ مجھے سچ سچ بتا دو کہ حمید کو کس نے مارا ہے اور یہ قِصّہ کیا ہے۔"

"پتہ نہیں ..... قرآن میرے سر پہ رکھ دو ..... اللہ کی قسم ....." و

یکلخت پھٹ پڑا لیکن فقرہ کوئی بھی پورا نہیں بولتا تھا۔ ہکلا رہا تھا اور یہ یوں تیزی سے ہکلاتے ہوئے بول رہا تھا جیسے مشین گن فائر ہو رہی ہو۔

"آرام آرام سے یار!" — میں نے دوستانہ لہجے میں کہا — "میں تم سے جو پوچھوں اس کا جواب دیتے جاؤ۔ اس لڑکی کے ساتھ تمہاری محبت ہے؟"

"ہاں جی" — اس نے جھینپ کر کہا۔

"تمہاری ملاقاتیں اس اُجڑے ہوئے مکان میں ہُوا کرتی تھیں؟"

"نہیں جی" — اُس نے جواب دیا — "وہ کبھی کبھی میرے گھر آتی تھی۔"

"لیکن اب تم اسے مکان میں ملنے گئے تھے۔"

"ملاقات نہیں ہوئی تھی" — اس نے کہا اور ایک ہی سانس میں بیشمار قسمیں کھا گیا۔

"سُنو یار!" — میں نے اُسے کہا اور جھوٹ بولا — "تم تو شاید مرد ہی نہیں ہو۔ تم سے تو یہ لڑکی دلیر ہے جس نے ہر ایک بات کُھل کر بتا دی ہے۔ موٹے کی بیوی نے بھی کچھ نہیں چھپایا۔ تم خود ہی ساری بات سُنا دو۔"

اُس نے اس کی تصدیق کی کہ لڑکی کے ساتھ اُس کی محبت ہے۔ کبھی لمبی ملاقات نہیں ہُوتی۔ عامل میر صاحب اُس سے پیسے لیتا رہا ہے اور اس کے عوض میر صاحب نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ لڑکی کی شادی اُس سے کرا دے گا۔ پیغام رسانی یہ عورت کرتی تھی۔ اسلم اور لڑکی کی ضد پر عورت نے ان کی لمبی ملاقات کا انتظام کیا جو یہ عورت مجھے تفصیل سے

سُنا چکی تھی۔ انہوں نے جو وقت مقرر کیا تھا اُس وقت اسلم گھر سے نکلا لیکن کچھ دیر ہو گئی۔ وقت اذان سے ذرا پہلے کا مقرر ہوا تھا مگر وہ اُس وقت اُجڑے ہوئے مکان کے دروازے پر پہنچا جب اذان ہو رہی تھی۔

"چاندنی بہت شفاف تھی" ــــ اسلم نے سُنایا ــــ "میں نے مکان کے دروازے میں ڈرتے ڈرتے قدم رکھا تو اندر سے ایک آدمی دوڑتا ہوا ڈیوڑھی میں آیا۔ میں ایک طرف تو ہو گیا لیکن وہ آدمی تیزی سے میرے قریب آ گیا۔ میں اُس سے چھُپ نہ سکا۔ وہ بھی رُک گیا۔ چاندنی اُس پر پڑ رہی تھی۔ پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ وہ میر صاحب تھے۔"

"اُن کے ہاتھ میں کوئی لاٹھی یا ڈنڈہ یا اس قسم کی کوئی اور چیز تھی؟" ــــ میں نے پوچھا۔

وہ یاد کرنے لگا اور بولا ــــ "اُن کے ہاتھ میں وہی کالا ڈنڈہ تھا جو ہر وقت اُن کے ہاتھ میں رہتا ہے۔"

مجھے یاد آ گیا کہ میں نے جب بھی میر صاحب کو دیکھا، یہ خوبصورت ڈنڈہ اُس کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اب تھانے میں بھی یہ ڈنڈہ اُس کے پاس تھا۔ میں نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ میر صاحب سے ڈنڈہ لے آؤ۔ کانسٹیبل ڈنڈہ لے آیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ یہ ڈیڑھ دو انچ موٹا اور گز بھر لمبا ڈنڈہ شاہ بلوط کی لکڑی کا تھا۔ خراد پر گول کیا ہوا تھا اور اس پر کالا چمکدار رنگ کیا گیا تھا۔ دونوں سروں پر تقریباً تین تین انچ لمبی پیتل کی شامیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ایک سرے پر سفید رنگ میں "یا محمدؐ" اور دوسرے سرے

پر "یا علیؑ" لکھا ہوا تھا۔

"یہی تھا؟"

"یہی ہو سکتا ہے" ــــ اسلم نے جواب دیا ــــ "یہی ڈنڈہ اُن کے ہاتھ میں رہتا ہے۔"

"آگے سناؤ" ــــ میں نے اسلم سے کہا ــــ "مکان کے دروازے پر تمہارا اور میر صاحب کا سامنا ہو گیا تو تمہارے درمیان کوئی بات بھی ہوتی تھی؟"

میر صاحب نے مجھے پہچان لیا اور کہا ــــ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اندر نہ جانا" ــــ چونکہ انہیں میری اور لڑکی کی محبت کا علم تھا اس لئے میں نے انہیں بتا دیا کہ اُسے چھت کی طرف سے اس مکان میں آنا تھا۔ میر صاحب نے کہا "وہ نہیں آئی۔ میں یہاں جنات کے بلاوے پر آیا تھا۔ وہ اگر آئی بھی تھی تو جنات نے اُسے واپس بھیج دیا ہو گا۔ اُس کی فکر نہ کرو۔ تم جاؤ۔ اندر نہ جانا" ــــ میں واپس چلنے لگا تو میر صاحب نے کہا ــــ "کسی کو یہ نہ بتانا کہ تم نے مجھے یہاں دیکھا تھا۔ یہ میرا اور جنات کا راز ہے۔ فاش کرو گے تو بنے ہوئے کام بگڑ جائیں گے" ــ مجھے اب بھی ڈر لگتا ہے کہ میں نے یہ راز آپ کو بتا دیا ہے معلوم نہیں میرا کیا بنے گا" ــــ وہ بُری طرح ڈرا ہوا تھا۔

عامل اور عورت ہم پیشہ

"میر صاحب کا اصل راز تھوڑی دیر بعد تمہارے سامنے آ جائے

گا" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "نہ اس مکان میں کوئی جن ہے نہ تمہارے میر صاحب کا کسی جن کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ اس کا پیشہ وہی ہے جو موٹے کی بیوی کا ہے۔ کیا تم مانتے ہو کہ لڑکی پر جن کا قبضہ ہے؟"

"میر صاحب نے مجھے بتا رکھا ہے کہ انہوں نے لڑکی میں جن داخل کر دیا ہے اور یہ جن ہماری مراد پوری کر دے گا" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"تم آگے سناؤ، کیا ہوا۔"

"میں گھر چلا گیا" ۔۔۔ اُس نے سنایا ۔۔۔ "میں موٹے کی بیوی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ لڑکی مکان میں گئی تھی یا نہیں، اور وہ خیریت سے تو ہے لیکن اس سے پہلے یہ خبر پھیل گئی کہ حمید کی لاش اُجڑے ہوئے مکان میں پڑی ہے۔ پھر پتہ چلا کہ وہ زندہ ہے۔ لوگ اُدھر کو دوڑے جا رہے تھے اور میں موٹے کی بیوی کے گھر چلا گیا۔ اُس سے پوچھا تو اُس نے بتا دیا کہ لڑکی گئی تھی اور جلدی واپس آ گئی تھی۔ اُس نے یہ نہیں پوچھا کہ تم اسے ملے ہو یا نہیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ لڑکی خیریت سے ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اس مکان میں کوئی واردات ہو گئی ہے اس لئے کسی سے بات نہ کر بیٹھنا کہ تم وہاں گئے تھے۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ میں وہاں گیا تھا اور اندر سے میر صاحب نکل رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اندر جانے سے روک دیا تھا۔"

"یہ سُن کر موٹے کی بیوی نے کچھ کہا تھا؟"

"اس کے منہ سے نکلا ۔۔۔ 'میر صاحب اندر سے نکلے تھے؟' ۔۔۔ وہ کچھ

حیران ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اُس نے اور کچھ نہیں کہا۔"

میں نے اس سے بھی چند اور باتیں پوچھیں اور اسے کانسٹیبلوں کے کمرے میں بٹھا دیا۔ موٹے کی بیوی کو بلایا۔

"کیا تم نے میر صاحب کو پہلے بتا دیا تھا کہ اسلم اور لڑکی کی ملاقات فلاں وقت اس مکان میں ہو رہی ہے؟" ۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"ایک روز پہلے وہ میرے گھر آتے تھے" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "لڑکی اور اسلم کا ذکر چل نکلا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ان دونوں کی ضد پر میں نے ان دونوں کی ملاقات کا یہ انتظام کر دیا ہے۔ میر صاحب کے پوچھنے پر میں نے انہیں ملاقات کا وقت بھی بتا دیا تھا۔"

"جب سب کو پتہ چل گیا کہ حمید مکان میں بے ہوش پڑا ہے تو میر صاحب تم سے ملا تھا؟ کچھ کہتا تھا؟"

"ملا تھا" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "گھبرایا ہوا تھا۔ بار بار کہتا تھا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے کسی کو یہ نہ بتانا کہ اسلم اور لڑکی اس مکان میں گئے تھے۔"

جنات کا بادشاہ میرے قبضے میں

اسے باہر بھیج کر میں نے میر صاحب کو بلایا اور اپنے سامنے بٹھا لیا۔ اُس کا ڈنڈہ میرے ہاتھ میں تھا۔

"میر صاحب!" — میں نے اُس سے پوچھا — "آپ نے حمید کے سر پر یہ ڈنڈہ یا محمد کی طرف سے مارا تھا یا علی کی طرف سے؟"

اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اداکاری کا تو وہ ماہر تھا۔ بولا — "آپ کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں .... ڈنڈے کا حمید کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے!" — اور وہ ہنس پڑا۔

"تم اُس مکان میں اُس وقت کیا کر رہے تھے؟"

"کس وقت جناب؟"

"جب اسلم تمہیں اس مکان کے دروازے پر ملا تھا" — میں نے رعب سے کہا اور ڈنڈے کا سرا اُس کی ٹھوڑی کے نیچے شہ رگ پر رکھ کر زور سے دبایا۔ اُس کے خراٹے نکلنے لگے — "سچ بولتے ہو یا نہیں"

وہ اتنا پیچھے ہٹا کہ کرسی سمیت پیچھے کو گرا۔ اُس کی پوزیشن یہ تھی کہ اُس کی ٹانگیں اُس کے سر کے ساتھ جا لگی تھیں۔ میں اُس کی ٹانگوں پر بیٹھ گیا۔ وہ کرسی میں پھنسا ہوا تھا۔ میرے وزن سے اُس کی کمر ٹوٹنے لگی تھی۔ وہ درد سے منہ کھول کر چلانے لگا تو میں نے ڈنڈے کا سرا اُس کے منہ میں ڈال دیا۔ وہ اگر مشتبہ ہوتا تو شاید میں اُس کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ ملزم نہیں بلکہ مجرم ہے اور مجھے چکر دے رہا ہے۔

"جب سچ بولنے کا ارادہ ہو تو ہاتھ سے اشارہ کر دینا.... پھر میں تمہیں عزت سے بٹھا کر سنوں گا" — میں نے کہا۔

وہ بڑی سخت اذیت میں تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔

میں اٹھا اور اسے بھی اٹھنے کو کہا — وہ بڑی مشکل سے اٹھا۔

"تم نے تین جھوٹ بولے تھے" — میں نے کہا — "اب سچ بولو"

میں اس معمے میں الجھا ہوا تھا کہ حمید ان لوگوں کے جال میں کس طرح آ گیا تھا؟ یہ سب کہہ رہے تھے کہ حمید کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ کیا یہ کوئی الگ واردات تھی؟ اگر میر صاحب اور اس عورت نے مجھے سو فیصد سچ بتا دیا تھا کہ وہ لڑکی کی منگنی تڑوانے اور اس کی شادی اسلم کے ساتھ کرانے کے لئے معاوضے پر ڈرامہ کھیل رہے تھے تو پولیس آفیسر کی حیثیت سے مجھ کو اس ڈرامے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے پاس رپورٹ حمید کے زخمی ہو کر بے ہوش ہونے کی آئی تھی۔ لڑکی کے باپ نے میر صاحب اور موٹے کی بیوی کے خلاف دھوکہ دہی اور نوسر بازی کی رپورٹ درج نہیں کرائی تھی۔ میں نے محض شک کی بنا پر اس عامل اور دیگر افراد کو گھیر رکھا تھا۔ میرے پاس شک کی وجوہات موجود تھیں۔ کھوجوں نے بتایا تھا کہ لڑکی مکان میں گئی تھی، پھر یہ ثابت ہو رہا تھا کہ میر صاحب بھی وہاں گیا تھا اور اس شخص کا اتنا مضبوط اور وزنی ڈنڈہ بھی میرے شکوک پختہ کر رہا تھا۔

میرے لئے اصل مشکل تو یہ پیدا ہو گئی تھی کہ حمید ضلعے کے ہسپتال میں جا کر بھی بے ہوش تھا۔ میں جب میر صاحب کو دوبارہ اپنے دفتر میں بلا رہا تھا اُس وقت میں نے اس ہسپتال کو فون کیا تھا۔ وہاں سے جواب ملا تھا کہ حمید ہوش میں نہیں آیا — امید افزا رپورٹ یہ ملی کہ کھوپڑی نہیں

ٹوٹی اور دماغ بھی محفوظ ہے۔ چوٹ اتنی شدید ہے کہ ہوش واپس آنے میں دو تین دن لگ جائیں گے، مگر سول سرجن نے یہ کہہ کر میرے ہوش گم کر دیئے کہ یہ خطرہ موجود ہے کہ مجروح کا حافظہ شاید ختم ہو جاتے۔ ایسے ہوتا ہے کہ سر پر شدید چوٹ سے پچھلی باتیں اور واقعات بھول جاتے ہیں اور مجروح اپنوں کو بھی نہیں پہچانتا۔

"میر صاحب!" ـــ میں نے کہا ـــ "اب میرے سامنے جنات کا نام نہ لینا۔ تمہاری اصلیت اور تمہارے جھوٹ بے نقاب ہو چکے ہیں"

"مجھے شیطان نے بہکا دیا تھا" ـــ اُس نے کہا اور اُس کے آنسو نکل آئے۔ میں اُس کی حوصلہ افزائی کرنے لگا اور اُسے تسلی بھی دینے لگا۔ میں نے اُسے یہ نہ کہا کہ سب سے بڑے شیطان تو تم خود ہو۔ اُس نے کہا ـــ "لڑکی میرے قبضے میں تھی پھر بھی میں اس کے پیچھے اس مکان میں چلا گیا۔ مجھے اس عورت نے باتوں باتوں میں بتایا کہ اسلم اور لڑکی اس مکان میں جا رہے ہیں تو میرے دل میں آئی کہ میں اسلم سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں اور وہاں لڑکی کی مجبوری سے فائدہ اُٹھاؤں۔ یہ میں آپ کو سچ بتا دوں کہ لڑکی مجھے پیسے دیتی تھی اور اُس نے اپنی پسند کی شادی ہو جانے کی صورت میں زیور دینے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن اُس نے میرے ساتھ اپنی عصمت کا سودا نہیں کیا تھا"

"تم نے اُس سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا؟"

"دو تین بار" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "اپنے اُوپر خود ہی طاری

کئے ہوتے دورے کے دوران جب میں کمرے سے سب کو نکال دیا کرتا تھا تو میرا مقصد یہی ہوتا تھا مگر لڑکی ہر بار مجھے کہتی تھی کہ میر صاحب میرے جسم اور میری روح کا مالک صرف اسلم ہے۔ ایک بار یہ لڑکی مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ میں نے اسے ڈرایا کہ میں سب کو بتاؤں گا کہ لڑکی کو کچھ بھی نہیں اور یہ منگنی تڑوانے کے لئے بہانے بنا رہی ہے۔ لڑکی نے بھڑک کر جواب دیا کہ میں تمہیں سارے شہر کے سامنے ننگا کر دوں گی اور بتاؤں گی کہ یہ شخص نوسرباز اور بدکار ہے۔ موٹے کی بیوی کو بھی اپنے ساتھ ملا لوں گی۔ حقیقت ہے کہ میں ڈر گیا۔ میں کچھ معاوضہ نقد اُس سے لیتا تھا، کچھ اسلم سے....

"جب پتہ چلا کہ لڑکی صبح کی اذان کے وقت اُجڑے ہوئے مکان میں جا رہی ہے تو میں نے سوچا کہ یہ سنہری موقع ہے۔ میں اذان سے ذرا پہلے واردات والے مکان میں چلا گیا اور برآمدے میں ایسی جگہ جا کھڑا ہوا جہاں چاندنی نہیں پڑتی تھی۔ میری نظریں اُس منڈیر پر لگی ہوئی تھیں جہاں نیم کے درخت کا ٹہن چھت پر گیا ہوا ہے۔ چاندنی میں مجھے لڑکی نظر آئی۔ وہ ٹہن پر آئی اور درخت سے نیچے اُتر آئی۔ وہ دبے پاؤں برآمدے میں چلی گئی۔ ابھی اسلم نہیں آیا تھا۔ میں لڑکی کی طرف چلنے لگا تو میں رُک گیا کیونکہ مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی....

"میں نے اندھیرے میں چھپ کر دیکھا۔ آنے والا چاندنی میں آیا تو میں نے پہچان لیا۔ وہ اسلم نہیں حمید تھا۔ میں حیران ہوا کہ حمید یہاں کیوں آیا ہے؟ کیا لڑکی نے اس کے ساتھ بھی یارانہ گانٹھ رکھا ہے؟ مجھے غصہ

آگیا تھا۔ اُدھر لڑکی آہستہ آہستہ اِدھر ہی آ رہی تھی، اِدھر حمید اُس کی طرف جا رہا تھا۔ حمید گٹھے ہوئے جسم کا جوان ہے۔ میں حیوانی بلکہ شیطانی جذبات کے جوش اور غلبے میں آ گیا۔ حمید ذرا اور آگے گیا تو میں نے دبے پاؤں پیچھے جا کر اُس کے سر پر بڑی زور سے ڈنڈہ مارا۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ بھاگ جائے گا مگر وہ گر پڑا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ لڑکی کو پکڑ لُوں گا مگر لڑکی نے دیکھ لیا تھا کہ میں نے کیا کیا ہے۔ اُس نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔ میں حمید کو دیکھنے لگا کہ وہ اُٹھے گا اور بھاگے گا۔ اتنے میں لڑکی دوڑ پڑی۔ پیشتر اس کے کہ میں اُس تک پہنچتا وہ درخت پر چڑھ گئی تھی ....

"حمید بے ہوش ہو گیا تھا۔ اذانیں ہو رہی تھیں۔ میرا شیطانی جوش سرد پڑ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ لوگ جاگنے لگے ہیں۔ میں دوڑ کر مکان سے نکلا تو دروازے میں اسلم کھڑا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے جنات نے بلایا تھا۔ اُس نے لڑکی کے متعلق پوچھا کہ آئی تھی؟ میں نے کہا کہ تم چلے جاؤ، وہ نہیں آئی۔ وہ چلا گیا۔"

ذرا غور کریں کہ کھوجی نے کتنا صحیح بتایا تھا کہ درخت سے اُتر کر لڑکی آہستہ آہستہ برآمدے تک گئی اور واپس دوڑتی گئی .... میر صاحب کا بیان طویل تھا۔ میری جرح اور مزید پوچھ گچھ نے اُسے زیادہ طویل کر دیا تھا۔ آپ کو اہم اور موٹی موٹی باتیں سُناتی ہیں۔

لڑکی ملزم نہیں گواہ تھی

اب اس ڈرامے کا اہم کردار رہ گیا تھا۔ یہ لڑکی تھی جسے میں نے تھانے بلانا مناسب نہ سمجھا۔ رات کو اُس کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ میں نے اس لئے سوچا تھا کہ مسلمان لڑکی کی عزت محفوظ رہے، لیکن میری سوچ بیکار تھی۔ لڑکی کو گواہی دینے کے لئے کئی بار عدالت میں جانا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ہمارے معاشرے کی بے معنی پابندیاں کہ اپنی برادری سے باہر شادی نہیں کی جا سکتی اور توہم پرستی اور عاملوں اور ٹونے ٹوٹکوں کی موجودگی آئے دن بھیانک اور شرمناک ڈراموں کو جنم دیتی رہتی ہے مگر ہم ان غیر اسلامی رسم و رواج سے آزاد ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔

رات کو میں پرائیویٹ کپڑوں میں لڑکی کے گھر چلا گیا۔ اُس کے باپ کو تسلی دلاسے دے کر بتایا کہ تفتیش کے سلسلے میں اُس کی بیٹی سے کچھ پوچھنے آیا ہوں۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ اُس باپ کی کیا حالت ہوئی جس کی جوان اور پردہ نشین بیٹی ایک واردات میں ملوث تھی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ اس واردات کے ساتھ اُس کی بیٹی کا کیا تعلق ہے۔ میں نے اُسے تفصیل سے بتا دیا کہ اس کے گھر میں کیا ناٹک کھیلا جا رہا تھا۔ اسے تسلی دی کہ اب اس کی بیٹی کو دورہ نہیں پڑے گا اور اُس کی بیٹی ملزم نہیں۔ وہ میری

منت سماجت کرنے لگا کہ میں اُس کی بیٹی کو گواہ بھی نہ بناؤں۔ میں نے اس لئے وعدہ کر دیا کہ لڑکی سے بیان لینا تھا لیکن میں یہ وعدہ پورا نہیں کر سکا تھا۔ لڑکی اہم گواہ تھی۔

لڑکی کو میرے پاس کمرے میں بھیج دیا گیا۔ میں نے اس کے باپ کو وہاں نہ بیٹھنے دیا لیکن اُسے یہ کہا کہ کمرے کے دونوں دروازے کُھلے رہنے دے۔ میں نے لڑکی سے بڑی مشکل سے بیان لیا۔ وہ پولیس سے ڈرتی تھی، اپنے ماں باپ سے ڈرتی تھی، اپنی بے عزتی سے ڈرتی تھی اور اس ڈر کے علاوہ شرم و حجاب بھی تھا جو اُسے بولنے نہیں دے رہا تھا۔ تھانیدار تو پتھروں سے بھی باتیں کرا لیا کرتے ہیں۔ اس لڑکی کو میں تھانے بلا لیتا تو وہ پانچ منٹ بعد پوری بات سُنا دیتی لیکن جہاں تک ممکن تھا میں ایک مسلمان لڑکی کی عزت کرنا چاہتا تھا۔

لڑکی نے جو بیان دیا وہ میر صاحب کے بیان کی اور موٹے کی بیوی اور اسلم کے بیانات کی تصدیق کرتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں کچھ اختلاف تھا جو میری جرح سے دُور ہو گیا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ میر صاحب اس سے بہت زیادہ معاوضہ مانگتا تھا جو لڑکی نے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اُس کی شادی اسلم کے ساتھ نہ ہو سکی تو وہ اسلم کے ساتھ گھر سے نکل جائے گی۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہُوا تو خودکشی کر لے گی۔

واردات کے متعلق اُس نے بتایا کہ وہ موٹے کی بیوی کے گھر صبح کی اذان سے ذرا پہلے گئی۔ دروازے کو ہاتھ لگایا تو کواڑ کُھل گیا۔ وہ عورت

صحن میں انتظار کر رہی تھی۔ کمرے سے اُس کے خاوند کے خراٹے سُنائی دے رہے تھے۔ لڑکی سیڑھیاں چڑھ گئی اور دبے پاؤں اُجڑے ہوئے مکان کی چھت پر گئی۔ مکان کی ہیبت نے اُسے بہت ڈرایا لیکن محبت کا جذبہ غالب آگیا۔ اس نے ڈر پر اس وجہ سے بھی قابو پا لیا کہ میر صاحب کی اصلیت کو وہ جان گئی تھی۔ میر صاحب کی نوسر بازی نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ اس مکان میں کوئی جن نہیں۔

وہ سلیپر چھت پر اُتار کر نیم کے ٹہن پر اوپر کا ٹہن پکڑ کر چلنے لگی۔ اس کا بایاں پاؤں اس نوکیلے ٹکڑے پر پڑا جس سے شاخ کبھی ٹوٹی تھی۔ اوپر جسم کا وزن پڑا تو یہ ٹکڑا اس کے پاؤں میں چلا گیا۔ اُس نے پاؤں اُوپر کو کھینچا تو ٹکڑا پاؤں سے نکلا۔ درد نے اُسے بے حال کر دیا۔ وہ ٹہن پر چلتی گئی۔ موٹے کی بیوی نے اُسے بتا دیا تھا کہ تنے سے کس طرح اُترنا ہے۔ اُترنا مشکل نہیں تھا۔ وہ اُتر کر آہستہ آہستہ برآمدے میں گئی۔ صحن میں کوئی آدمی آیا۔ وہ پہچان نہ سکی۔ یہ جان گئی کہ وہ اسلم نہیں۔ یہ آدمی برآمدے میں آیا۔ اندھیرے سے جانے کون نکلا۔ اُس نے پیچھے سے اس آدمی کے سر پر ڈنڈہ مارا۔ آدمی گر پڑا۔ میں ڈر کر درخت کی طرف دوڑی اور بہت تیزی سے درخت پر چڑھ کر چھت پر پہنچی۔ سلیپر پہنے اور دبے پاؤں موٹے کے مکان کی سیڑھیاں اُتر گئی۔ موٹے کی بیوی کو کچھ نہ بتایا....

"میرا پاؤں زخمی تھا۔ واپس اپنے گھر گئی تو سب سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ماں کو جگا کر کہا کہ میں ننگے پاؤں صحن میں چلی گئی تھی۔ یہ کیل پاؤں میں

اُتر گئی ہے۔ میں نے ثبوت کے طور پر ایک کیل ہاتھ میں لے لی تھی جو مجھے معلوم تھا کہاں رکھی ہے۔ ماں نے ہلدی گھی میں کاڑھ دی جو میں نے پاؤں پر باندھ دی۔ ماں کو زخم نہ دکھایا کیونکہ یہ زخم کیل کا نہیں تھا۔"

یہ اُس کے بیان کے اہم حصے ہیں جو میں نے آپ کو سُنا دیئے ہیں۔ میں نے اُس کے بائیں پاؤں کا سلیپر اپنے قبضے میں لے لیا۔ اُس نے یہ سلیپر دھویا نہیں تھا۔ اس میں جمے ہُوئے خون کی موجودگی ضروری تھی۔ یہ بھی سیرالوجسٹ کے پاس بھیجنا اور "ایگزیبٹ" کے طور پر عدالت میں پیش کرنا تھا .... لڑکی نے جُرم کی داستان سنا دی لیکن یہ ابھی مکمل نہیں تھی۔ اسے صرف حمید مکمل کر سکتا تھا جو پچیس میل دُور بیہوش پڑا تھا۔

میں نے یہ فرض کر کے کہ حمید ہی ہوش میں نہیں آئے گا، مقدمہ تیار کرنے کے لئے شہادتیں اکٹھی کرنی شروع کر دیں۔ میر صاحب کو میں نے گرفتار کر لیا اور اگلے روز اُسے مجسٹریٹ کے پاس اقبالی بیان ریکارڈ کرنے کے لئے وہیں لے گیا جہاں ضلعے کا ہسپتال تھا۔ اُسے مجسٹریٹ کے پاس چھوڑ کر میں ہسپتال چلا گیا۔ حمید کو دیکھا۔ ڈاکٹر نے خوشخبری سنائی کہ کسی وقت حمید ذرا سی آنکھ کھولتا ہے اور فوراً بند کر لیتا ہے۔ میں نے اُسے آہستہ سے بُلایا۔

"حمید"۔ اُس نے منہ میری طرف کیا مگر آنکھیں نہ کھول سکا۔ میں نے پوچھا — "کچھ افاقہ محسوس کر رہے ہو؟" — اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ وہ افاقہ محسوس کر رہا تھا۔

باہر آ کر ڈاکٹر نے مجھے کہا — "دماغ محفوظ ہے۔ بات سمجھتا ہے۔ اگر آج

ہوش میں آ گیا تو دو روز بعد بیان دینے کے قابل ہو جائے گا۔"

اُس کا باپ اور چھوٹا بھائی باہر اُداس اور پریشان بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں حمید کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ہر روز اتنی دُور سے اُسے دیکھنے آتے تھے۔ میں نے اُس کے باپ کو تسلی دی کہ حمید بچ گیا ہے اور تیزی سے ٹھیک ہو رہا ہے۔ اُسے یہ بھی بتایا کہ مجرم پکڑا گیا ہے۔ اُسے جب مُجرم کا نام بتایا تو وہ حیرت زدہ ہو گیا جیسے سُن ہو گیا ہو۔

وہ عورت کو پکڑنے گیا تھا

میر صاحب کا اقبالی بیان قلمبند ہو چکا تھا۔ اسے جوڈیشل حوالات (جیل) میں بھیج دیا گیا تھا۔ میں اپنے تھانے میں آ گیا۔ دوسرے دن سورج غروب ہو رہا تھا جب مجھے فون پر اطلاع ملی کہ میں اگلے روز بیان لینے کے لئے آ جاؤں۔ میں دوسرے دن پہلی گاڑی سے چلا گیا۔ حمید کو دیکھا۔ ہوش میں آ چکا تھا لیکن بولنے میں دِقت محسوس کرتا تھا۔ ڈاکٹر ساتھ رہا۔ اُس کا بیان مختصر تھا جو نصف گھنٹے میں ریکارڈ ہو سکتا تھا لیکن میں نے یہ بیان چھ گھنٹوں میں ریکارڈ کیا۔ حمید دو منٹ سے زیادہ بولتا تھا تو اُس کا سَر دُکھنے لگتا تھا۔ آدھے پونے گھنٹے تک وہ خاموش پڑا رہتا پھر بولنے لگتا تھا۔

اُس کا بیان اتنا سا ہی تھا کہ وہ واردات کی رات حسبِ معمول صبح کی اذان سے پہلے جاگ اُٹھا اور ورزش کے لئے اُوپر چلا گیا۔ اُس کے مکان

کی چھت عام مکانوں سے زیادہ اُونچی تھی اور یہ مکان اُجڑے ہُوئے مکان کے تقریباً ساتھ تھا۔ درمیان میں گلی تھی۔ یہ حمید کے مکان کا پہلو تھا۔ اُس نے مالش کے لئے ابھی کپڑے نہیں اُتارے تھے۔ اُس کی نظر واردات والے مکان پر گئی۔ اس کے ساتھ والے مکان پر اُسے ایک عورت جاتی نظر آئی۔ حمید اُسے دیکھتا رہا۔ شفاف چاندنی میں اُسے عورت اچھی طرح نظر آ رہی تھی لیکن چہرہ نہیں پہچانا جاتا تھا۔

عورت نیم کے ٹہن پر چڑھی اور غائب ہوگئی۔ حمید کو معلوم تھا کہ اُجڑا ہُوا یہ مکان بدمعاشی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ وہ خود چال چلن کا صاف تھا۔ اُسے یہ شک تھا کہ یہ موٹے کی بیوی ہے اور اس کا آشنا نیچے مکان میں ہوگا۔ یہ شک اُسے اس لئے ہُوا کہ عورت موٹے کے مکان کی چھت سے آئی تھی۔ یہ عورت نیک نام نہیں تھی لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ اس کے قابلِ اعتراض مراسم ہیں۔ حمید اس خیال سے اپنی چھت سے اُتر کر واردات والے مکان کی طرف چل پڑا کہ اس عورت کو موقعہ پر پکڑے گا۔

وہ مکان کے اندر چلا گیا۔ اُسے عورت نظر آگئی اور حمید کو دیکھ کر برآمدے میں چلی گئی جہاں تک چاندنی نہیں پہنچتی تھی۔ وہ اُس کی طرف گیا۔ برآمدے میں داخل ہُوا تو پیچھے سے اُس کے سر پر کوئی چیز اتنے زور سے لگی کہ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا پھر اُسے کوئی ہوش نہ رہی۔

"تمہیں معلوم ہے تمہارے سر پر ضرب لگانے والا کون تھا؟" — میں

نے پوچھا۔

"مجھے گذشتہ رات کچھ ہوش آئی ہے" — اس نے کہا — "ہوش آتے ہی مجھے یاد آیا کہ میں اُجڑے ہُوئے مکان میں گیا تھا۔ مجھ پر خوف طاری ہوگیا۔ اس مکان میں جن اور چڑیلیں رہتی ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے مارا ہوگا اور وہ عورت انسان نہیں ہوگی جسے میں نے دیکھا تھا"

میں نے اُسے بتایا کہ وہ کون تھی اور یہ بھی بتایا کہ اُس کے سر پہ ڈنڈہ مارنے والے میر صاحب تھے تو اُسے یقین نہ آیا۔

عدالت میں جب اُس نے میر صاحب کو ہتھکڑی میں دیکھا تو اُسے یقین آنے لگا، اور جب میر صاحب کو چار سال سزائے قید بامشقت سُنائی گئی تو اُسے پُورا یقین ہوگیا۔

موت کا مینجر

جابر سنگھ راجپوت بہت بڑا جاگیردار تھا۔ وہ جنگلوں کے ٹھیکے بھی لیا کرتا اور جنگل میں لکڑی کا کوئلہ تیار کرا کے دُور دُور تک سپلائی کیا کرتا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ بھی تھا۔ بے پناہ دولت کے علاوہ اُسے شہرت اور انگریزوں کی حکومت میں عزت اس طرح ملی کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی اور انگریز ہندوستان کے دولت مندوں سے اپنے نمک کا حق مانگ رہے تھے۔ انہوں نے جنگی اخراجات پورے کرنے کے لئے چندہ مانگنا شروع کر دیا جسے "وار فنڈ" کہتے تھے۔ جابر سنگھ جو سکھ نہیں بلکہ ہندو راجپوت تھا، باقاعدگی سے دل کھول کر وار فنڈ میں چندہ دینے لگا۔ اُس نے اپنے بعض مزارعوں اور اپنے زیرِ اثر دیہات میں سے کئی ایک جوانوں کو فوج میں بھرتی کرا دیا۔ یہ بھی انگریزوں کی ایک ضرورت تھی جو وہ پوری کرتا رہتا تھا، مگر وہ یہ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہا کہ جنگ میں جیت انگریزوں کی ہوتی ہے یا جرمنوں کی۔ وہ جنگ کے پہلے سال مر گیا۔ اس وقت اُس کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی۔

اُس کی جاگیر کی وارث اُس کی بیوی تھی اور ایک بیٹا۔ ان دونوں نے وار فنڈ میں چندہ نقد اور اناج کی صورت میں جاری رکھا اور انگریزوں کے منظورِ نظر بنے رہے۔ جابر سنگھ کو مرے ابھی دو سال پورے نہیں ہوئے تھے کہ اُس کی بیوی دلجیت کماری قتل ہو گئی۔ میں نے تو اس جاگیردار اور اس کی بیوی کا کبھی نام بھی نہیں سُنا تھا۔ میں واردات کے مقام سے بہت دور ہیڈ کوارٹر میں تھا۔ ایک روز میری اور ایک انگریز انسپکٹر ڈوبگن کی انگریز ڈی۔ ایس۔ پی جان ریڈی کے دفتر میں طلبی ہوئی۔

"ایک ایسی عورت قتل ہو گئی ہے جس کے تعاون کو حکومت برطانیہ فراموش نہیں کر سکتی" ـــ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا ـــ "اُسے قتل ہوئے پندرہ دن گزر گئے ہیں متعلقہ ایس۔ ایچ۔ او کو ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ تم دونوں یہ فائل دیکھ لو۔ میرا خیال ہے کہ مقتولہ کے لواحقین اور دیگر لوگ ایس۔ ایچ۔ او کے ساتھ تعاون نہیں کر رہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ جاگیرداروں کے گھروں میں کیسے کیسے پُراسرار ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ متعلقہ ایس۔ ایچ۔ او ایسے ہی ڈرامے میں شامل ہو گیا ہے یا وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکا" ـــ ڈی۔ ایس۔ پی نے انگریز انسپکٹر ڈوبگن سے مخاطب ہو کر کہا ـــ "مجھے اس خاندان کے ساتھ اس لئے دلچسپی ہے کہ اس نے ہماری حکومت کی بہت مدد کی ہے۔ پیچھے ایک جوان بیٹا رہ گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ جنگی مدد جاری رکھے گا۔ یہ تمہارا فرض ہے کہ قاتل کو پکڑو اور اُسے سزا دلاؤ تاکہ مرنے والوں کا بیٹا یہ نہ سمجھے کہ انگریزوں نے اُس

کی کوئی مدد نہیں کی۔"

میں اور انسپکٹر ڈوگن اسی روز پینتیس میل دُور متعلقہ تھانے کو روانہ ہو گئے اور وہاں ڈاک بنگلے میں قیام کیا۔ ایس۔ ایچ۔ او کو مسل کے ساتھ وہیں بلا لیا۔ اُس نے بتایا کہ مقتولہ بہت خوبصورت عورت تھی۔ اُس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی، لیکن پچیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ وہ جابر سنگھ کی تیسری بیوی تھی۔ پہلی دو کو اُس نے طلاق دے دی تھی کیونکہ دونوں سے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ مقتولہ کی عمر پندرہ سولہ سال تھی جب جابر سنگھ نے اُس کے ساتھ شادی کی تھی۔ ایک سال بعد اُس نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ اس کے بعد اس کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

میں نے یہ بات ذہن نشین کر لی کہ جب مقتولہ کی شادی جابر سنگھ کے ساتھ ہوئی اُس وقت اُس کی عمر پندرہ سولہ سال تھی اور جابر سنگھ چالیس سال کا ہو چکا تھا۔ میں نے یہ بھی ذہن میں محفوظ کر لیا کہ پہلی دو بیویوں سے اولاد نہ ہوئی۔ مقتولہ نے صرف ایک بچے کو جنم دیا پھر اس کی بھی اولاد نہ ہوئی۔

ایس۔ ایچ۔ او نے بتایا کہ مقتولہ کا یہ اکلوتا بیٹا اٹھارہ انیس سال کا ہے۔ اکثر جاگیرداروں کے بیٹوں کی طرح اپنے آپ کو شہزادہ سمجھتا ہے شرابی کبابی اور عیاش ہے۔ اس کا ایک چچا ہے۔ وہ اتنا بڑا جاگیردار تو نہیں، خوشحال زمیندار ہے۔ جابر سنگھ کی جاگیر سے ڈیڑھ دو میل دُور اس چچا کی اراضی ہے۔

"کوئی جائداد کا جھگڑا تو نہیں؟" — انسپکٹر ڈوگن نے پوچھا۔

"نہیں" — ایس۔ ایچ۔ او نے بتایا — "اگر قتل میں اس شخص (چچا) کا ہاتھ ہوتا تو اُس کا رویہ کچھ اور ہوتا۔ یہ تو صبح و شام میری جان کو آیا رہتا ہے کہ تفتیش تیز کرو اور قاتل کو پکڑو۔ مجھے شک ہے کہ جابر سنگھ کا بیٹا چونکہ عیش و عشرت میں پڑا ہوا ہے، اس لئے اس کا چچا اس کا سرپرست بن کر جاگیر پہ قبضہ کرنا چاہتا ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے لڑکے کا سرپرست بننے کے لئے اس کی ماں کو قتل کرا دیا ہو" — میں نے کہا — "آپ نے اس پہ غور کیا ہے؟ .... تفتیش کی پیروی میں لڑکا بھی دلچسپی لے رہا ہوگا۔"

"دلچسپی اس کا چچا لے رہا ہے" — ایس۔ ایچ۔ او نے جواب دیا — "لڑکے نے کبھی اتنی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔"

"جائداد کس کے نام ہے؟"

"کچھ بیٹے کے نام اور کچھ مقتولہ کے نام" — اُس نے جواب دیا — "جابر سنگھ کا وصیت نامہ موجود ہے۔"

کماری کا گلا گھونٹا گیا

"کماری رات کے دوران قتل ہوئی" — ایس۔ ایچ۔ او نے بتایا — "دوسرے دن آٹھ بجے اس کا بیٹا تھانے آیا۔ یہ گاؤں تقریباً دو میل دُور ہے۔

میں وہاں گیا۔ لاش سونے کے کمرے کی بجائے ایک اور کمرے میں فرش پر پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ معائنہ کیا تو گردن پر صاف نشان تھے۔ گلا ہاتھوں سے گھونٹا گیا تھا۔ کوئی اور چوٹ نہیں تھی۔ مقتولہ نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ ساڑھی پر کوئی نشان نہیں تھا۔ بظاہر دست درازی یا کوئی اور زیادتی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سونے کے کمرے میں جا کر دیکھا۔ پلنگ پوش اس طرح بچھا ہوا تھا کہ اس پر ایک بھی سلوٹ نہیں تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مقتولہ بستر پر نہیں لیٹی۔ اُس نے بڑی قیمتی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا تھا کہ وہ ابھی سوئی نہیں تھی۔"

"کوئی مال چوری ہوا؟"

"نہیں" ۔۔۔ ایس۔ ایچ۔ او نے جواب دیا ۔۔۔ "میں نے معلوم کیا ہے۔ کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔ لاش کے گلے میں بڑا ہی قیمتی ہار تھا۔ دو انگوٹھیاں تھیں جن میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ سونے کی چوڑیاں تھیں۔ صرف ان زیورات کی قیمت بے اندازہ ہے ..... اس کے بیٹے سے پوچھا کہ رات اُس نے ماں کو کس وقت زندہ دیکھا تھا۔ اُس نے بتایا کہ شام کے کھانے کے وقت ماں کو زندہ دیکھا تھا۔ اُنہوں نے اکٹھے کھانا کھایا تھا۔ اس کے بعد وہ دوستوں کے ساتھ کہیں نکل گیا اور آکر سو گیا۔ وہ اتنی جلدی اُٹھنے کا عادی نہیں تھا لیکن نوکروں نے اسے صبح سویرے جگا کر بتایا کہ اس کی ماں ایک کمرے میں مری پڑی ہے۔ میں نے نوکروں اور نوکرانیوں سے پوچھ گچھ کی۔ کسی نے کوئی کام کی بات نہ بتائی۔ سب نے کہا کہ یہ تو

مہارانی کا محل ہے۔ اندر کے بھید ہم نہیں جانتے۔ میں نے سب کو اکیلے اکیلے بلا کر ڈرایا، دھمکایا، لالچ بھی دیتے مگر مجھے ان سے کچھ بھی حاصل نہ ہُوا۔"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ کیا کہتی ہے؟"

"موت گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی ہے" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "مقتولہ کے ساتھ اور کوئی بیہودگی نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر کے اندازے کے مطابق مقتولہ آٹھ یا نو گھنٹے پہلے مری ہے۔ اس حساب سے وہ آدھی رات کے لگ بھگ قتل ہوئی۔"

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ وہ آدھی رات تک سوئی نہیں تھی" ۔۔۔ انسپکٹر ڈوگن نے کہا ۔۔۔ "آپ نے یہ معلوم کیا ہو گا کہ اس وقت تک وہ کیا کرتی رہی؟ کہیں باہر گئی ہوئی تھی؟ اگر گھر رہی تو کس کمرے میں رہی؟ باہر کا کوئی آدمی، کوئی مہمان اُس کے ساتھ تھا؟"

"یہی تو مشکل ہے کہ کوئی کچھ بھی نہیں بتاتا" ۔۔۔ ایس۔ ایچ۔ او نے کہا ۔۔۔ "سب کوری تختی دکھاتے ہیں۔ مجھے یہ شک ہوتا ہے کہ نوکروں وغیرہ پر دباؤ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ جاگیردار کسی نوکر یا مزارعہ کو قتل کر کے لاش غائب کر دیں تو ان کے خلاف رپورٹ نہیں ہوتی۔ یہ جبر سے بھی ان لوگوں کا منہ بند کر لیتے ہیں اور انعام و اکرام سے بھی۔"

"کوئی دشمنی؟" ۔۔۔ میں نے پوچھا ۔۔۔ "لڑکے نے یا چچا نے کسی پر شک کا اظہار کیا ہے؟"

"دونوں نے کہا ہے کہ کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں" ۔۔۔

ایس۔ایچ۔او نے جواب دیا۔"دونوں میں سے کسی نے بھی کسی پر شک کا اظہار نہیں کیا۔"

ہم نے ایس۔ایچ۔او کی تحریر کی ہوئی ضمنیاں دیکھیں۔ساری فائل کا مطالعہ کیا۔وہ اتنے دن اندھیرے میں ہاتھ مارتا رہا تھا۔ہمیں الف سے تفتیش شروع کرنی تھی۔مخبروں کو بہتر طریقے سے استعمال کرنا تھا۔

زیورات لاش کے ساتھ تھے

ہم اگلے روز جائے وقوعہ پر گئے۔آپ نے فلموں میں جاگیرداروں کے مکان دیکھے ہوں گے جو اندر سے نوابوں اور مہاراجوں کے محلات جیسے ہوتے ہیں۔ہندوستانی فلموں میں جاگیرداروں کے محل اکثر دکھائے جاتے ہیں۔جابر سنگھ راجپوت کا مکان ایسا ہی تھا۔کمروں کا کوئی حساب نہیں تھا۔ہم نے پہلے اس محل کو ارد گرد گھوم کر دیکھا۔ہر طرف دروازے تھے کسی بھی طرف سے اندر جایا اور باہر نکلا جا سکتا تھا۔یہ الگ تھلگ مکان تھا۔اس کے ارد گرد باغ اور کھیت تھے۔اس سے کچھ دور تین چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔یہ سب اسی جاگیردار کے زیرِ نگیں تھے۔

میں دیہات اور قصبوں کے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں سراغرسانی اور تفتیش کا عادی تھا۔کچے صحن، کچی چھتیں اور کچی دیواریں کوئی نہ کوئی سراغ دے ہی دیا کرتی تھیں۔ان کے مکین سادگی میں یا پولیس کے

خوف سے یا میری چکنی چپڑی باتوں کے جال میں آکر راز اُگل دیا کرتے تھے مگر اس محل اور اس ماحول کو دیکھ کر میں گھبرا گیا۔مجھے یہ معلوم تھا کہ ان جاگیرداروں کے محلات میں آقا اور اُس کی اولاد کی خوشنودی اور انعام و اکرام حاصل کرنے کے لئے غیبت اور سازش چلتی رہتی ہے۔قتل تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور قتل کو چھپا بھی لیا جاتا ہے۔ایسے جاگیردار اپنے علاقے کے تھانیدار اور رجسٹرڈ بدمعاشوں کو اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ان کے باقاعدہ وظیفے مقرر ہوتے ہیں۔پاکستان میں بھی ایسے جاگیردار اور وڈیرے موجود ہیں جنہوں نے مملکت کے اندر اپنی ریاستیں قائم کر رکھی ہیں۔وہاں کے حالات جا کر دیکھو تو ایسے لگتا ہے جیسے وہاں تک نہ اسلام کی روشنی پہنچی ہے نہ پاکستان کا قانون۔ان کے ہاں کی کسی واردات کی رپورٹ تھانے پہنچ بھی جاتی ہے تو تفتیش بہت دشوار ہوتی ہے کیونکہ ان کے ملازم اور مزارعے وغیرہ اپنے آقاؤں کے دباؤ کے تحت کچھ بتاتے نہیں یا پولیس کو گمراہ کرتے ہیں۔

جابر سنگھ کی جاگیر میں بھی مجھے یہی گورکھ دھندا دکھائی دے رہا تھا کہ یہاں کے ایس۔ایچ۔او (سب انسپکٹر مہندر پال) کو کیا دشواریاں پیش آتی ہوں گی۔اس کی دو دشواریاں تو صاف ظاہر تھیں۔ایک رشوت اور دوسری یہ کہ وہ ہندو تھا۔اگر یہ کسی مسلمان جاگیردار کے گھر کی واردات ہوتی تو مہندر پال کئی ایک مسلمان مردوں اور عورتوں کو تھانے بلا کر انہیں ذلیل و خوار کر چکا ہوتا۔مجھے یہ سہولت حاصل تھی کہ میرے ساتھ انگریز انسپکٹر

تھا۔ انگریزوں کا جتنا رعب اور دبدبہ تھا، اتنا کسی دیسی تھانیدار کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی انگریز اسسٹنٹ سب انسپکٹر ہی ہوتا تو بھی لوگ اُسے پولیس کپتان کہا کرتے تھے۔

ہم نے جابر سنگھ راجپوت کے بیٹے کو ساتھ لیا اور اُس کی راہنمائی میں واردات والے کمرے میں گئے۔ مشکل یہ تھی کہ واردات ہوتے دو ہفتے گزر گئے تھے۔ کوئی کھرا کھوج ملنے کا امکان ختم ہو گیا تھا۔ ہم نے لاش بھی نہیں دیکھی تھی۔ مقتولہ کے بیٹے اور سب انسپکٹر مہندر پال سے پوچھا کہ لاش کہاں پڑی تھی اور کس پوزیشن میں پڑی تھی۔ مہندر پال نے اُس جگہ لیٹ کر لاش کی پوزیشن بتائی۔ ہم نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کھڑکیاں اور دروازے دیکھے۔ سونے والا کمرہ اس کمرے سے ملحق تھا۔ درمیان میں دروازہ تھا۔ واردات والا کمرہ خاص قسم کے مہمانوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

ہم نے سب انسپکٹر مہندر پال سے کہا کہ وہ گھر کے تمام نوکروں اور نوکرانیوں کو اکٹھا کر کے الگ بٹھا لے۔ خود ان کے پاس بیٹھا رہے۔ نہ خود ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی بات کرے نہ انہیں آپس میں کوئی بات کرنے دے۔ وہ چلا گیا تو ہم نے مقتولہ کے بیٹے کو اسی کمرے میں بٹھا لیا۔ وہ قدبُت اور ڈیل ڈول سے زیادہ عمر کا لگتا تھا لیکن اس کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی۔ وہ اس جاگیر کا شہزادہ تھا جہاں اسے مقوی غذائیں اور زندگی کی ہر ایک سہولت حاصل تھی۔ اُس کا قدبُت ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اُس

کے چہرے پر نوجوانی والی معصومیت نہیں تھی پختگی سی تھی۔ آنکھیں بتاتی تھیں کہ راتوں کو جاگتا ہے اور شراب خور بھی ہے۔

ہمارے سوال کے جواب میں اُس نے بتایا کہ کسی کے ساتھ ایسی دشمنی نہیں کہ وہ میری ماں کو قتل کر جاتا، اور کسی پر شک بھی نہیں۔ میرے دوسرے سوال کے جواب میں اُس نے بتایا کہ گھر سے کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔ مقتولہ نے بیش قیمت زیورات پہن رکھے تھے۔ یہ سب لاش کے ساتھ موجود تھے۔ سنگار میز پر اور اس کے ایک دراز میں بھی زیورات اور پیسے پڑے تھے۔ یہ سب جہاں رکھے تھے وہیں پائے گئے۔ ہمارے پوچھنے پر اُس نے یہ بھی بتایا کہ کسی کے ساتھ جائداد کا جھگڑا بھی نہیں۔

انسپکٹر ڈوبگن کے متعلق یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ غیر معمولی طور پر ذہین تھا۔ اُردو بڑی صاف بولتا تھا اور اُس نے خوبی یہ پیدا کر لی تھی کہ ہندوستانیوں کی نفسیات، ہر ایک مذہب کی موٹی موٹی باتیں اور لوگوں کے عادات و اطوار سے پوری طرح واقف ہو گیا تھا۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ اُس کا دادا جو فوج میں کپتان تھا ۱۸۵۷ء کے غدر (ہماری جنگِ آزادی) میں کانپور میں بہت بہادری سے لڑا تھا۔ اب کیپٹن ڈوبگن ہندوستان کے باشندوں کو مفتوح سمجھتا اور ان سے اپنے قانون کا پورا پورا احترام کرانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ بال کی کھال اُتارنے والا پولیس آفیسر تھا۔ تفتیش کے دوران اُسے وقت کا، دن اور رات کا احساس نہیں رہتا تھا۔ وہ جب کسی سے پوچھ گچھ کر رہا ہوتا تو اُسے اس کا کوئی احساس

نہیں ہوتا تھا کہ اُس کے سامنے بیٹھا ہُوا آدمی اُونچے رُتبے، عہدے یا حیثیت کا ہے یا کوئی معمولی سا عادی مجرم۔ اُس کا اصول تھا کہ مشتبہ یا گواہ صرف مشتبہ یا گواہ ہوتا ہے، اُس کا کوئی عہدہ یا رُتبہ نہیں ہوتا۔ اگر حیثیت کو دیکھا جاتے تو تفتیش نہیں ہو سکتی۔ اُس کی پوچھ گچھ کا انداز دوستانہ ہُوا کرتا تھا اور اُس کے چہرے پر مسکراہٹ رہتی تھی۔ وہ تھرڈ ڈگری (تشدّد) سے گریز کرتا تھا لیکن بعض افراد کے لئے یہ طریقہ ضروری ہوتا تھا۔ تشدّد کے دوران بھی اس کا انداز دوستانہ اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔

میں مسکراہٹ کی برکتوں کا قائل ہوں۔ یہ بالکل دُرست ہے کہ مسکراہٹ میں جادو ہے۔ یہ جادو صرف تفتیش میں ہی نہیں، ہر جگہ اور ہر کام میں چلتا ہے۔

میں نے کبھی محبّت نہیں کی

"ذرا غور کرو راجکمار!" ـــ ڈوبگن نے مقتولہ کے بیٹے کو اصلی نام کی بجائے راجکمار کہا۔ راجکمار مہاراجوں کے بیٹے کہلایا کرتے تھے۔ ڈوبگن نے کہا ـــ "تمہارے خاندان کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں۔ تمہیں کسی پر شک نہیں اور کسی کے ساتھ جائداد کا جھگڑا بھی نہیں اور یہ واردات ڈکیتی کی بھی نہیں، پھر تمہاری ماں کو کس نے قتل کیا ہے؟ کیوں کیا ہے؟

اگر تم کہو کہ اُس نے خودکُشی کی ہے تو میں نہیں مانوں گا۔ کیا وہ چھت سے لٹکتی ہوئی پائی گئی تھی؟"

"نہیں!"

"کیا اُس کے گلے کے گرد رسّی تھی؟"

"نہیں!"

"کیا اُس نے زہر پیا ہے؟"

"نہیں!"

"تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ مرنے والی نے زہر نہیں پیا؟"

"انسپکٹر مہندر پال نے بتایا تھا کہ ہاتھوں سے گلا گھونٹا گیا ہے" ـــ مقتولہ کے بیٹے نے جواب دیا ـــ "اُس نے بعد میں بتایا تھا کہ ڈاکٹر نے بھی یہی لکھا ہے!"

"دیکھو راجکمار!" ـــ انسپکٹر ڈوبگن نے کہا ـــ "کوئی انسان اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ کر خودکُشی نہیں کر سکتا، کیونکہ اُس کا جب دم گھُٹنے لگتا ہے تو اُس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ یہ موت خودکُشی سے واقع نہیں ہُوتی۔ یہ قتل کی واردات ہے .... اور راجکمار! تمہارے دل میں کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ قاتل اس گھر میں موجود ہے۔ اگر قاتل باہر کا ہے تو اس کی کوئی وجہ ہو گی جو تمہیں معلوم ہونی چاہیئے۔"

"گھر میں نوکروں اور نوکرانیوں کے سوا کون ہے" ـــ لڑکے نے

کہا — "ان میں سے کوئی اتنی جرأت نہیں کر سکتا۔"

"تمہاری ماں نے کسی کو نوکری سے نکالا ہوگا؟"

"نہیں۔"

"کسی مزارعہ کی حق تلفی کی ہوگی؟"

"ایسا بھی نہیں ہوا" — اُس نے جواب دیا — "میری ماں کھیت کھلیان کے کاموں میں دخل نہیں دیا کرتی تھی۔ مزارعوں اور دوسرے کسانوں وغیرہ کے ساتھ ہمارا کوئی جھگڑا نہیں۔"

"تم نے اُسے قتل کی رات آخری بار کس وقت زندہ دیکھا تھا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے یہ نوٹ کیا تھا کہ مقتولہ کا بیٹا عقل اور زبان کے لحاظ سے چالاک اور ہوشیار نہیں تھا۔ چالاک بننے کی یا یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ اس ریاست کا والی ہے اور وہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ اس سے مجھے یہ اطمینان سا ہوا کہ اس کے سینے میں کوئی راز ہوا تو وہ ہم نکلوا لیں گے۔ یہ نوجوان اتنا چالاک نہیں تھا کہ مجھے اور ڈوگن کو بیوقوف بنا سکتا۔

"میں نے کھانے پر ماں کو دیکھا تھا" — اُس نے انسپکٹر ڈوگن کے سوال کا جواب دیا۔

"تم نے اکٹھے کھانا کھایا ہوگا؟"

"جی ہاں!" — اُس نے جواب دیا۔

"اُس وقت تمہاری ماں کی مزاجی کیفیت کیسی تھی؟" — ڈوگن

نے پوچھا — "وہ خوش تھی؟ پریشان تھی؟ یا وہ خوش تھی نہ پریشان؟"

"مجھے وہ خوش ہی نظر آ رہی تھی" — اُس نے جواب دیا — "پریشان نہیں تھی۔"

"تم کتنی دیر تک اُس کے ساتھ رہے؟"

"کھانے کے بعد میں آدھے گھنٹے تک اُس کے ساتھ رہا۔"

"پھر تمہاری ماں گھر رہی تھی یا کہیں باہر چلی گئی تھی یا اُس کے پاس کوئی آیا تھا؟"

وہ پھر سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا — "مجھے معلوم نہیں ..... میں باہر چلا گیا تھا۔"

"تم جب باہر سے واپس آتے تھے تو تمہاری ماں سو گئی تھی یا کہیں باہر گئی ہوئی تھی یا اُس کے پاس باہر کا کوئی آدمی بیٹھا تھا؟"

"میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا تھا۔"

"وہ ان کپڑوں میں یعنی اتنی قیمتی ساڑھی میں تو نہیں سوتی ہوگی" — ڈوگن نے اُس سے پوچھا — "وہ کن کپڑوں میں سویا کرتی تھی؟"

وہ اُٹھا اور دوسرے کمرے سے ماں کے سونے والے کپڑے اُٹھا لایا۔ یہ ایک کھلا پاجامہ اور کھلا سا کرتہ تھا۔ یہ ریشمی کپڑے تھے۔

"کوئی ملازم غیر حاضر تو نہیں؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "سب حاضر ہیں۔"

"تمہاری ماں نے کسی کو بہت سی رقم قرض تو نہیں دے رکھی تھی؟"

"مجھے معلوم نہیں"۔ اُس نے جواب دیا۔ "شاید مُنشی جانتا ہو۔"

"حساب کتاب مُنشی رکھتا ہے؟"

"جی ہاں!"

"اتنی بڑی جاگیر کا انتظام کون چلاتا ہے؟" ڈوبگن نے پوچھا۔ "تم خود یا کوئی منیجر ہے؟"

"میں خود"۔ اُس نے جواب دیا۔ "ہم نے منیجر کبھی نہیں رکھا۔"

"باہر کی کسی عورت یا مرد کے ساتھ تمہاری ماں کے گہرے مراسم تھے؟" — میں نے پوچھا۔

"کچھ لوگ آتے رہتے تھے"۔ اُس نے جواب دیا۔ "گہرے مراسم کسی کے ساتھ نہیں تھے۔"

"تمہارے لئے رشتوں کے پیغام تو آتے رہتے ہوں گے؟" — میں نے پوچھا۔

"دو پیغام آئے تھے"۔ اُس نے جواب دیا۔ "میری ماں نے پسند نہیں کئے۔"

"ان میں کوئی تمہاری پسند کا تھا؟"

اُس نے فوراً جواب نہ دیا، ذرا سوچ کر بولا۔ "میری اپنی کوئی پسند نہیں تھی۔"

"اس عمر میں تمہاری کوئی پسند نہیں تھی؟" ڈوبگن نے مذاق کے لہجے میں ہنس کر کہا۔ "میرا تو خیال ہے کہ تم کسی لڑکی سے ضرور محبت

کرتے ہو گے۔ تم اتنے مردہ دل تو نظر نہیں آتے۔"

وہ ہنس پڑا اور بولا۔ "نہیں۔ میں نے کبھی محبت نہیں کی۔"

ہم یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کسی اور جاگیردار یا بڑے زمیندار گھرانے نے مقتولہ کے بیٹے کو رشتہ دینا چاہا ہو گا جو اس لڑکے کو تو پسند ہو گا لیکن لڑکے کی ماں نے قبول نہیں کیا ہو گا۔ لڑکی کے باپ نے اُسے قتل کرا دیا ہو گا۔ میں نے اور ڈوبگن نے اس سے بھید لینے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہُوا۔ اس کے علاوہ ہم اور جو کچھ معلوم کرنا چاہتے تھے، وہ نہ کر سکے۔ اس لڑکے کو اپنی ماں کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

"کوئی ایسی نوکرانی ہے جو تمہاری ماں کے زیادہ قریب رہی ہو؟"

ذرا سُرور میں آنے کے لئے!

اُس نے ایک نوکرانی کا نام لیا۔ اُس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ آپ اُسے بملا سمجھ لیں۔ ہم نے مقتولہ کے بیٹے کو باہر بھیج دیا اور بملا کو بُلایا۔ اُسے میں نے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ وہ شکل و صورت اور لباس سے نوکرانی نہیں لگتی تھی۔ اُس کا جسم بھی اچھا اور چہرہ بھی اچھا تھا۔ اُس کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ گہری عورت ہے۔ اُس کی عمر پینتیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

"تم اس سے پہلے تھانیدار کو جو کچھ بتا چکی ہو وہ بھول جاؤ" — میں نے اُسے اپنے سامنے بٹھا کر کہا — "یہ بھی یاد رکھ لو کہ اس جاگیر کی مالکن قتل ہو گئی ہے۔ اگر تم نے کوئی بات چھپانے کی کوشش کی یا کوئی بات غلط بتائی تو تمہیں ہم گرفتار کر لیں گے اور سزائے قید دلائیں گے۔ دوسروں کے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں اپنے آپ کو مصیبت میں نہ ڈال لینا۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ ہمیں بہت سی اندرونی باتوں کا علم ہے۔ تمہاری مالکن کا بیٹا ابھی ابھی ہمیں بہت کچھ بتا کر گیا ہے۔ تم جو کچھ جانتی ہو وہ بتا دینا۔ اُسی نے ہمیں بتایا ہے کہ تمہاری (مقتولہ) کے جتنا قریب تم رہتی تھیں اتنا اُس کا یہ بیٹا بھی نہیں رہتا تھا اور تم تمہاری کے دل کی باتوں سے بھی واقف تھیں۔ کیا یہ صحیح ہے کہ تم پر مالکن بہت مہربان تھی؟"

"مہربان اس لئے تھی کہ میں اُس کی بہت خدمت کرتی تھی" — اُس نے جواب دیا۔

"تم کب سے اس گھر میں ملازم ہو؟"

"میری شادی مالکن نے کرائی تھی" — اُس نے جواب دیا — "میں دراصل مالکن کے ساتھ ہی آئی تھی۔ میں اُس کے ماں باپ کے گھر میں ملازم تھی۔ مالکن مجھ سے دو تین سال بڑی تھی۔ میں اُس کی ڈولی کے ساتھ آئی تھی۔ پھر جوان ہوئی اور یہیں شادی ہو گئی۔"

"مالکن اپنے خاوند کے ساتھ خوش تھی؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "سولہ سال کی لڑکی اتنی بڑی عمر

کے آدمی کے ساتھ کیسے خوش رہ سکتی ہے!"

"روتی تھی؟"

"روتی تو نہیں تھی" — اُس نے جواب دیا — "خاوند نے اُسے شہزادی بنا کر رکھا تھا۔ اُداس اُداس رہتی تھی۔"

"مردوں کے ساتھ اُس کی ظاہری یا درپردہ دوستی تھی؟"

"جہاں تک میں جانتی ہوں، نہیں تھی" — اُس نے جواب دیا — "خاوند کی زندگی میں اُس کی اپنی الگ تھلگ کوئی دوستی نہیں تھی۔"

"خاوند کے مرنے کے بعد؟"

"میں نے کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا" — اُس نے جواب دیا — "وہ باہر بھی نہیں جاتی تھی۔"

"وہ عموماً کس وقت سویا کرتی تھی؟" — ڈوبگن نے پوچھا۔

"کھانے کے دو اڑھائی گھنٹے بعد" — اُس نے جواب دیا۔

ہم نے حساب لگایا کہ وہ دس بجے تک سو جایا کرتی تھی۔

"تم رات کس وقت تک اُس کے ساتھ رہتی تھیں؟" — ڈوبگن نے پوچھا — "میں اُس کے خاوند کی زندگی کی بات نہیں کر رہا۔ خاوند کے مرنے کے بعد تم کب تک اُس کے ساتھ رہتی تھیں؟"

"میں اُسے سونے والے کپڑے پہناتی تھی تو وہ مجھے چلے جانے کو کہتی تھی۔"

"قتل کی رات تم نے اُسے سونے والے کپڑے پہناتے تھے؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "کبھی کوئی مہمان ہوا اور مالکن کو دیر تک جاگنا ہو تو مجھے جلدی چھٹی دے دیتی تھی۔ جس رات وہ مری ہے اُس رات اُس نے مجھے جلدی چھٹی دے دی تھی۔"

"اُس رات کون مہمان تھا؟"

"مہمان تو کوئی نہیں تھا" — اُس نے ایسے لہجے میں جواب دیا جس میں گھبراہٹ سی تھی — "مالکن نے کہا تھا کہ تم چلی جاؤ۔ میں چلی آئی۔"

"کماری شراب پیتی تھی؟" — ڈوگن نے پوچھا۔

"خاوند کے مرنے کے بعد اُس نے پینی شروع کر دی تھی۔"

"زیادہ پیتی تھی؟"

"اتنی زیادہ نہیں" — اُس نے جواب دیا — "ذرا سرور میں آ جاتی تو اور نہیں پیتی تھی۔"

"قتل کی رات بھی اُس نے پی تھی؟"

"میرے سامنے نہیں پی" — اُس نے جواب دیا۔

رات کا مہمان

مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی تھی۔ میں نے کہا — "ہاں ہاں۔ بولو۔ گھبراؤ نہیں۔"

"اُس نے میرے سامنے نہیں پی تھی" — اُس نے کہا۔

"پوری بات بتاؤ" — ڈوگن نے میری طرح یہ محسوس کر کے کہ اس عورت کی زبان پر کوئی اور بات آئی تھی جو اُس نے روک لی ہے، اُس سے کہا — "اُس نے تمہارے سامنے نہیں پی تھی، پھر کیا ہوا تھا؟"

"نہیں، نہیں" — اُس نے ہمیں ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ دو پولیس افسروں کی آنکھوں میں دُھول نہیں جھونک سکتی تھی۔

"سنو بملا!" — میں نے اُسے کہا — "پہلے تھانیدار کی بات اور تھی۔ تم نے اُسے جو بتایا وہ اُس نے سُن لیا اور تم اطمینان سے بیٹھ گئیں کہ چلو بات گول ہو گئی ہے۔ ہم تھانے سے نہیں پولیس کے بڑے دفتر سے آئے ہیں۔ یہ انگریز پولیس کپتان ہے۔ تم نے سوچا نہیں کہ اتنا بڑا انگریز افسر خود کیوں آیا ہے۔ ہم نے تمہاری عزت کی خاطر یہیں تفتیش شروع کر دی ہے مگر تمہارا رویّہ بتا رہا ہے کہ تمہیں عزت نہیں چاہیئے۔ ہم تمہیں تھانے لے چلیں گے اور وہاں پولیس کے صحیح طریقے سے تفتیش کریں گے۔ تم ہم سے کچھ چھپا رہی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کماری کے قتل میں تمہارا بھی ہاتھ ہے۔ ہم تمہیں گرفتار کر کے لے جائیں گے۔"

میں جوں جوں بولتا جا رہا تھا، اُس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ خوف کا تاثر بڑا صاف تھا۔

"قتل کی رات اور شراب کی پوری بات بتاؤ" — میں نے ذرا رُعب سے کہا — "وہ بات بتاؤ جو تمہاری زبان پہ آ گئی تھی مگر تم نے نگل لی ہے۔"

"اُس نے مجھے کہا تھا کہ دو گلاس رکھ جاؤ اور تم چلی جاؤ" — بملا نے

جواب دیا — "میں بوتل اور دو گلاس اور کھانے کی کچھ چیزیں اس کمرے میں ٹی پائی پر رکھ کر چلی گئی تھی۔"

"دوسرا گلاس کس کے لئے تھا؟"

"منیجر صاحب کے لئے" — اُس نے دبی زبان میں جواب دیا۔

"منیجر؟" — انسپکٹر ڈوبگن نے حیرت سے پوچھا اور میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"کہاں کا منیجر بملا؟" — میں نے پوچھا — "یہ منیجر کماری کے پاس آتا رہتا تھا؟"

"اجیت اسی جاگیر کا منیجر ہے" — اُس نے جواب دیا۔

"باہر ملازموں میں موجود ہے؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "مالکن کے قتل کے بعد نظر نہیں آیا۔"

"کیا وہ اکثر کماری کے ساتھ شراب پیا کرتا تھا؟"

"کبھی کبھی" — اُس نے جواب دیا۔

"کیا وہ آدمی رات تک بھی کماری کے اسی خاص کمرے میں رہتا تھا؟"

"آدھی رات کے بعد تک بھی" — بملا نے جواب دیا اور اُس نے اچانک ہاتھ جوڑ کر کہا — "آپ کو اپنے خدا کی قسم ہے، کسی کو یہ نہ بتانا کہ میں نے آپ کو یہ بات بتائی ہے، ورنہ میں ماری جاؤں گی۔"

"تمہیں کس کا ڈر ہے؟" — میں نے کہا — "کماری تو مر چکی ہے۔ اُس کا راز بتا دو گی تو وہ تمہارا کیا بگاڑ لے گی؟"

"اُس کا بیٹا جو موجود ہے" — اُس نے کہا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ کہنے لگی — "وہ کہے گا کہ تم نے اندر کی باتیں باہر کیوں نکالی ہیں!"

"بیٹے کو معلوم تھا کہ اُس کا منیجر اُس کی ماں کے کمرے میں آدھی رات تک رہتا اور شراب پیتا ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں" — اُس نے جواب دیا — "بیٹا گھر میں رہتا ہی کب ہے!"

اُس کے چونکہ آنسو بہہ رہے تھے اس لئے اُسے تسلی دلاسہ دیا اور یقین دلایا کہ کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا جائے گا کہ اُس نے ہمیں اندر کی باتیں بتائی ہیں۔ انسپکٹر ڈوبگن نے بھی اُسے شفقت کے لہجے میں کہا کہ اُسے پورا تحفظ دیا جائے گا .... میرے دماغ میں یہ آئی کہ مقتولہ کا ایسا ہی تعلق جیسا اُس نے منیجر کے ساتھ قائم کر رکھا تھا، کسی اور کے ساتھ بھی ہوگا۔ اس آدمی نے یا منیجر نے رقابت کے جوش میں آکر کماری کو قتل کر دیا ہوگا۔ میں نے اس شک کے تحت بملا سے پوچھا کہ کماری کے پاس اور کون رات دیر تک رہتا تھا۔

"اور کوئی نہیں تھا" — اُس نے جواب دیا۔

ماں، ماموں اور بھانجا

میں نے اور ڈوبگن نے طرح طرح کے سوالوں سے اُسے بہت کریدا لیکن وہ اسی پہ قائم رہی کہ منیجر کے سوا دوسرا کوئی آدمی مقتولہ کے کمرے میں نہیں جاتا تھا۔ اس پوچھ گچھ کے دوران اُس نے بتایا کہ صرف ایک اور آدمی تھا جو کماری کے ساتھ کبھی کبھی آکر ٹھہرتا تھا لیکن یہ اُس کا سگا بھائی تھا۔ بملا نے بتایا کہ کماری کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ اس کا ایک ہی بھائی ہے جو کبھی کبھار بہن سے ملنے آیا کرتا تھا اور دو چار روز یہیں رہتا تھا۔

بملا کے منہ سے ایک اور انکشاف نکل گیا۔ اُس نے بتایا کہ کماری کے قتل سے کوئی ایک مہینہ پہلے اُس کا بھائی آیا تھا۔ اُس کی اور کماری کے بیٹے کی آپس میں تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ یہ جھگڑا بیٹے کے کمرے میں ہو رہا تھا۔ بملا نے قریب سے گزرتے سُنا تھا۔ کماری کا بھائی یہ کہہ کر کمرے سے نکلا تھا کہ میں آئندہ تمہاری صورت دیکھنے یہاں نہیں آؤں گا۔

"تم نے کماری سے پوچھا ہو گا کہ ان میں جھگڑا کس بات پہ ہوا تھا؟" — ڈوبگن نے پوچھا۔

"پوچھا تھا" — اُس نے جواب دیا — "اُس نے کہا تھا کہ دونوں غصیلے

ہیں۔ معلوم نہیں کس بات پر جھگڑ پڑے تھے۔"

"اس کے بعد بھی کماری کا بھائی آیا تھا؟"

"قتل کے روز آیا اور اُسی شام چلا گیا تھا" — اُس نے جواب دیا

"اُن کا جھگڑا جائداد پہ تو نہیں تھا؟"

"مجھے وجہ معلوم نہیں ہو سکی" — اُس نے جواب دیا — "وجہ معمولی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ کماری کے بھائی کے جانے کے بعد ماں بیٹے میں بھی جھگڑا ہوا تھا۔ اُس روز کے بعد ماں بیٹے میں بول چال بند ہو گئی تھی۔"

"کیا ان کی بول چال کماری کے قتل تک بند رہی تھی؟" — مجھے اچانک ایک خیال آگیا تھا جس کے تحت میں نے یہ سوال پوچھا۔

"جی ہاں!" — بملا نے جواب دیا — "آخر دم تک یہ حال رہا کہ ماں بیٹا ایک دوسرے کے آمنے سامنے بھی نہیں آتے تھے۔"

"کھانا الگ الگ کھاتے ہوں گے؟"

"بالکل الگ" — بملا نے جواب دیا۔

"کماری کو کھانا کون کھلاتا تھا؟"

"میں کھلاتی تھی۔"

"قتل کی رات ماں بیٹے نے اکٹھے کھانا کھایا تھا؟"

"نہیں جی!" — اُس نے جواب دیا — "میں کہہ رہی ہوں کہ ماں بیٹا ایک دوسرے کے سامنے آنے سے بھی گریز کرتے تھے۔"

"کیا تم ذرا سا بھی اشارہ نہیں دے سکتیں کہ ماں بیٹے میں ایسا

کون سا جھگڑا تھا جس سے کہ ان کی بول چال ہی بند ہو گئی تھی؟"

جیسی ماں ویسی بیٹی

اُس نے سر جھکا لیا اور خاموش رہی۔ اب کے ہم نے اُسے تھانے لے جانے کی دھمکی نہ دی۔ ذرا سی دیر تو ہم بھی خاموش رہے، پھر میں نے یہ کہہ کر حوصلہ دیا کہ اُس نے ہماری بہت مدد کی ہے اور وہ انعام کی حقدار ہے۔ کچھ ایسے ہی اور الفاظ دوستانہ لہجے میں کہہ کر میں نے اُس کے دل پر اپنا قبضہ مضبوط کر لیا۔ اگر کچھ کسر رہ گئی تھی تو وہ ڈوبگن نے پوری کر دی۔ بملا کے ساتھ اُس کا رویّہ اور انداز مجھ سے زیادہ دوستانہ بلکہ مشفقانہ ہو گیا تھا۔ اس سے اُس کی زبان رواں ہو گئی۔

اُس نے میرے سوال کا جواب یہ دیا ــــ "میں نے اصل جھگڑا معلوم کرنے کی بہت کوشش کی ہے لیکن مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔"

"جس طرح تم اپنی مالکن کی خاص ملازمہ رہی ہو، اس طرح تمہاری مالکن کے بیٹے کا کوئی ملازم ہو گا" ــــ میں نے کہا ــــ "میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا ملازم ہو گا جو اُس کے زیادہ قریب رہتا ہو گا۔"

میں نے کوئی بہت گہری بات نہیں کی تھی۔ اس امیر کبیر اور مادر پدر آزاد طبقے کے بعض افراد نے کوئی نہ کوئی ہوشیار اور چالاک ملازم اپنا معتمد اور ہمراز بنا رکھا ہوتا ہے۔ ایسے ملازم عموماً غنڈے اور

بدمعاش ہوتے ہیں اور درپردہ عیاشیوں کے بندوبست کرتے ہیں۔ بملا نے ایک ملازم کا نام بتایا اور ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر کہا کہ ہم کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں کہ اُس نے ہمیں یہ نام بتایا ہے۔ ہم نے اُسے یقین دلا دیا کہ اُس کا راز فاش نہیں ہو گا۔ اُسے یقین آ گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ ہم اُس پر آسیب کی طرح غالب آ گئے تھے۔ اگر تفتیشی افسر دیانتدار اور فرض شناس ہو تو وہ بڑے کائیاں مجرم پر بھی اسی طرح آسیب کی طرح غالب آ سکتا ہے اور پتھروں سے بھی دودھ نکال سکتا ہے۔ بملا کو ہم پر اعتماد تھا۔ اُسے ہم نے یہ احساس ہونے ہی نہیں دیا کہ قاتل کے پکڑے جانے کی صورت میں اُسے عدالت میں شہادت دینی پڑے گی۔ ہم ابھی ابتدائی مرحلے میں تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ قتل میں اس کا بھی ہاتھ ہو۔

اُس نے اُس خاص ملازم کا نام بتایا اور یہ بھی کہا کہ وہ باہر ملازموں میں بیٹھا ہے۔ ہم نے بملا کو باہر بھیج دیا اور سب انسپکٹر مہندر پال کو اندر بلا کر کہا کہ اس عورت کو کہیں جانے نہ دے اور کسی سے یہ بات بھی نہ کرے، پھر مہندر پال سے کہا کہ فلاں نام کے ملازم کو اندر بھیج دے۔ ملازم اندر آیا تو اُسے ہم نے پرے بٹھا کر آپس میں انگریزی میں تبادلہ خیالات کیا تاکہ یہ آدمی کچھ نہ سمجھ سکے۔ انسپکٹر ڈوبگن بڑا ہی ذہین آدمی تھا۔ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ ہندوستانیوں کی نفسیات اور طور طریقوں کو خوب سمجھتا تھا۔ اُس نے کہا کہ مہاراجوں، نوابوں اور اس سطح کے جاگیرداروں کے ہاں نوکروں کی اپنی سیاست چلا کرتی ہے۔ ان میں آقاؤں کا منظورِ نظر

بننے کی رسہ کشی ہوتی رہتی ہے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ مُلا نے ہمیں جو کچھ بتایا ہو وہ سو فیصد سچ ہو۔ اس کی تصدیق یا تردید کے لئے ڈوبگن نے ایک طریقہ اختیار کیا۔ مقتولہ کے بیٹے کے خاص ملازم کو ہم نے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اسے بھی ہم نے ابتدا میں وہی کچھ کہا جو مُلا سے کہا تھا۔ اسے بھی ہم نے ڈرایا کہ اُس نے کوئی بات چھپائی یا غلط بتائی تو اُسے قتل کے شک میں گرفتار کر لیا جائے گا۔ ہم نے جب اُس سے پُوچھ گچھ شروع کی تو اُس کے جوابوں اور انداز سے صاف پتہ چلتا تھا کہ ٹال رہا ہے اور انجان بننے کی کوشش کر رہا ہے۔

"دیکھو دوست!"— ڈوبگن نے اپنا طریقہ استعمال کیا —"ہمیں تو کچھ بھی معلوم نہیں کہ یہاں کیا ہوتا رہا ہے۔ تم جو کچھ کہو گے ہم اسی کو سچ مان لیں گے، لیکن یہ سوچ لو کہ تم سے پہلے ہم کس کا بیان لے چکے ہیں۔ ہم نے تمہیں اُسی کے کچھ بتانے پر بلایا ہے۔ اُس کی باتوں سے پتہ چلا ہے کہ جو تم جانتے ہو وہ اور کوئی نہیں جانتا۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ کماری کیوں قتل ہُوئی ہے۔"

"وہ جھوٹی اور مکار عورت ہے"— اس آدمی نے بھڑک کر کہا —"اُس نے آپ کو یہ تو نہیں بتایا ہو گا کہ وہ خود کیسی بدچلن اور بدمعاش ہے۔ اپنی نوجوان بیٹی کے ذریعے چھوٹے سرکار (مقتولہ کا بیٹا) کو پھانسنے اور انعام لینے کی کوشش کرتی رہتی ہے؟"

"اچھا؟"— میں نے حیرت کی ایکٹنگ کرتے ہُوئے کہا —

"ارے؟ ... یہ بات ہے؟ یار! تم تو بڑے اُستاد ہو۔ مُلا کی بیٹی کی ابھی شادی نہیں ہُوئی؟"

"شادی ہو چکی ہے جی!"— اُس نے کہا —"یہ ساتھ والے گاؤں میں خاوند کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی شادی ہمارے مُنشی کے بیٹے کے ساتھ ہوئی ہے لیکن جیسی ماں ویسی بیٹی۔ بیٹی یہاں آتی رہتی ہے اور چھوٹے سرکار کے اردگرد گھومتی رہتی ہے۔"

"اور چھوٹے سرکار اتنے شریف ہیں کہ نوجوان لڑکی سے مُنہ نہیں لگاتے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا حضور!"— اُس نے جواب دیا۔

"تم جانتے ہو"— میں نے اُس کی گردن پہ ہاتھ رکھ کر زور سے ہلایا اور کہا —"بات پوری کرو۔"

اُس نے میرے مُنہ کی طرف دیکھا تو کچھ گھبرایا۔

"بتاتا ہوں حضور!"— اُس نے کہا —"چھوٹے سرکار اور لڑکی کے درمیان کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مُلا لڑکی کو خود چھوٹے سرکار کے پاس بھیجتی تھی۔"

"مُلا اور کیا بدمعاشی کرتی تھی؟"

"ہمارے منیجر صاحب کے ساتھ ساتھ لگی رہتی تھی"— اُس نے جواب دیا —"اُسے اس عورت نے پھانس رکھا تھا۔"

"منیجر کہاں ہے؟"

اس سوال پر وہ گھبرا گیا۔ رُک رُک کر بولا — "میں کیا جانوں کہاں چلا گیا ہے؟"

"کب گیا تھا؟" — ڈوبگن نے پوچھا — "کماری کے قتل سے پہلے گیا تھا یا بعد میں؟"

"مجھے یہ بھی معلوم نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میں باہر کے کاموں میں لگا رہتا تھا۔ مینیجر صاحب اندر کام کرتے تھے۔"

"چھوٹے سرکار کا اپنی ماں کے ساتھ کیا جھگڑا تھا؟"

"میں نے کبھی پوچھا نہیں۔"

"قتل کی رات تمہارا چھوٹے سرکار کہاں تھا؟"

"کہیں باہر گیا ہوا تھا۔"

ہم نے اس سے بہت سے سوال کئے۔ اتنے زیادہ کہ میرا مُنہ خشک ہو گیا مگر یہ شخص بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ ڈوبگن نے مجھے انگریزی میں کہا — "یہ بہت کچھ جانتا ہے۔ یہاں اس پر وقت ضائع نہ کرو۔ اسے تھانے لے چلتے ہیں۔"

میں نے سب انسپکٹر مہندر پال کو اندر بلا کر کہا کہ اس آدمی کو اپنے کانسٹیبلوں کے حوالے کر دو۔ اسے تھانے لے چلنا ہے۔

مقتولہ کا مُنشی

ہمیں ابھی قتل کا باعث تو معلوم نہیں ہوا تھا لیکن یہ اُمید بندھ

گئی تھی کہ انہی نوکروں چاکروں سے معلوم ہو جائے گا۔ میں نے اور ڈوبگن نے صرف ان دو گواہوں کی باتوں اور ان کے انداز پر غور کیا تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ قتل اس جاگیر کی سازشوں اور ذاتی چپقلش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ماں بیٹے کا جھگڑا اور بیٹے کا ماموں سے جھگڑا ہمارے لئے بہت اہم تھا۔ بیٹے کے ملازم نے بتایا تھا کہ بملا کی بیٹی منشی کی بہو ہے اور اس کا تعلق مقتولہ کے بیٹے کے ساتھ ہے۔ یہ بظاہر نوکروں نوکرانیوں کی سیاست بازی تھی لیکن ان لوگوں سے ہمیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ تفتیش میں بعض غیر اہم اور بظاہر بے معنی باتیں بہت مدد کیا کرتی ہیں۔ بملا سے ہم نے باتیں اُگلوا لی تھیں۔ مقتولہ کے بیٹے کے اس خاص ملازم سے بھی ایک دو اشارے مل گئے تھے۔ وہ بملا کو جھٹلا رہا تھا۔

ہم نے منشی کو بلا لیا۔ یہ ذہن میں رکھتے کہ منشی ایسی جاگیروں میں اہم شخصیت ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت اکاؤنٹنٹ کی سی ہوتی ہے۔ آپ نے ہندو منشی نہیں دیکھے۔ ہیرا پھیری کے ماہر ہوتے ہیں۔ بات ہاتھ جوڑ کر کرتے ہیں مگر دوسرے کے ہاتھ کاٹ لیتے ہیں۔ جاگیرداروں کی اولاد انہیں خوش رکھتی اور ان سے پیسے اُڑاتی رہتی ہے۔ مختصر یہ کہ منشی بھی اندر کے بہت سے بھید جانتے ہیں۔

"آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ سب انسپکٹر مہندر پال ان لوگوں سے یہ باتیں نہیں کہلوا سکا جو ہم نے کہلوالی ہیں؟" — انسپکٹر ڈوبگن نے کہا — "میں اس کا یہ جواز ماننے کو تیار نہیں کہ ان لوگوں نے اس

کے ساتھ تعاون نہیں کیا۔"

"میرا خیال ہے" —— میں نے کہا —— "کہ مہندر پال ان لوگوں کے ساتھ تعاون کرتا رہا ہے۔"

"مہندر پال کو بھی شاملِ تفتیش کرنا پڑے گا" —— ڈوبگن نے کہا —— "اسے کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہو گا۔"

میں نے اپنے ساتھ لاتے ہوئے ایک کانسٹیبل کو بلایا۔ میں مصلحتاً دو مسلمان کانسٹیبلوں کو ساتھ لایا تھا۔ ان میں سے ایک کو بلا کر کہا کہ وہ سب انسپکٹر مہندر پال پر نظر رکھے اور وہ یہاں کے کسی بھی آدمی کے ساتھ بات کرے یا کسی آدمی کو اِدھر اُدھر لے جائے تو کانسٹیبل اُس کے ساتھ ہو جائے یا ان کی باتیں سُننے کی کوشش کرے ...... مُنشی آیا بیٹھا تھا۔

"لالہ جی!" —— میں نے منشی سے کہا —— "تمہاری مالکن قتل ہو گئی ہے۔ وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ تم جانتے ہو کہ انگریز اسے اور اس کے خاوند کو کتنا چاہتے تھے۔ ہمیں انگریز سرکار نے بھیجا ہے کہ ہم قاتل کو پکڑیں۔ تم اس گھر کے اندر کے حالات جانتے ہو۔ اگر کچھ چھپانے کی کوشش کرو گے تو اس سے ہم یہ مطلب لیں گے کہ تم بھی اس قتل میں شریک ہو۔"

اتنی سی بات سُن کر مُنشی نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اُس کے دانت باہر نکل آئے اور وہ سر سے پاؤں تک اس طرح کانپنے لگا جیسے اُسے جاڑا

دے دی گئی ہو۔ سر پر اُس کی پگڑی اور ناک پر رکھی ہوئی عینک بھی ہل رہی تھیں۔ ہنسی تو مجھے بھی آئی لیکن ڈوبگن اپنی ہنسی دبا نہ سکا۔ بچوں کی طرح ہنسا۔ میں نے بھی ہنسی کو بے لگام کر دیا۔ ہم ہنسے تو منشی اور زیادہ خوفزدہ ہو گیا۔ یہاں میں آپ کو یہ بتا دوں کہ ہندو خواہ مُنشی ہو یا پردھان منتری، لُومڑی کی طرح مکّار ہوتا ہے۔ اسے جب خوفزدہ ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے تو اس منشی کی طرح خوفزدگی کا مظاہرہ کرتا ہے مگر خوفزدگی میں بھی فریب کاری سے باز نہیں آتا۔ دوسرے سمجھتے ہیں کہ یہ تو خوف سے ختم ہو گیا ہے لیکن اُس کا ڈنک ختم نہیں ہوتا۔ شکست خوردگی کے عالم میں بھی موقعہ ملے تو ڈنک مار جاتا ہے۔ مرا ہُوا ہندو اندر سے پوری طرح زندہ ہوتا ہے۔ ہندو جب آپ کے ساتھ کوئی معاہدہ یا سمجھوتہ کرے تو اس کا مطلب دوستی نہیں بلکہ کوئی اور گہری چال ہوتا ہے۔ ہندو کو ذاتی سطح پر دیکھ لیں، قومی سطح پہ دیکھ لیں، بین الاقوامی سیاست میں دیکھ لیں، اس کا لومڑی جیسا کردار ہر سطح پر ایک سا نظر آتا ہے۔

مُنشی کی بیٹی، مقتولہ کا بیٹا

اس جاگیر کا مُنشی جو شکل و شباہت اور ڈیل ڈول سے اپنی پوری قوم کی ذہنیت کی نمائندگی کر رہا تھا، ہمارے سامنے ہاتھ جوڑے کانپ رہا تھا اور ہم دونوں ہنس رہے تھے۔ ڈوبگن بھی اس نسل سے واقف

تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہندو کی خوفزدگی سے متاثر ہو کر اس پر رحم کرنا بہت بڑی حماقت ہے۔

"حجور!" — منشی نے کہا — "کیا میں کسی کو قتل کرنے کے قابل ہوں؟"

"تم بہت قابل آدمی ہو لالہ!" — میں نے کہا — "دوسروں کے پاپ اپنے کھاتے میں نہ لکھنا۔ ہم سے یوں نہ ڈرو۔ اگر تمہیں کسی اور کا ڈر ہے تو ہمیں بتا دو۔ تمہاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ ہم جو پوچھیں وہ صحیح صحیح بتا دینا، ورنہ تمہاری بڑی خرابی ہو گی۔"

"آپ کسی کو بتائیں گے تو نہیں کہ میں نے آپ کو کیا بتایا ہے؟" — اُس نے پوچھا۔

"تمہیں سب سے زیادہ ڈر کس سے ہے؟" — ڈوگن نے اس سے پوچھا۔

"چھوٹے سرکار کا۔"

"کیا اُس نے تمہیں کہا تھا کہ پولیس کو کچھ نہ بتانا؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں حجور!" — اس نے جواب دیا — "اُس نے کہا تھا کہ پولیس کے ساتھ کوئی فالتو بات نہ کرنا۔"

"ہم تم سے کوئی فالتو بات نہیں پوچھیں گے" — میں نے کہا — "بملا کی بیٹی تمہاری بہو ہے۔ ہمیں یہاں سے پتہ چلا ہے کہ تمہاری

بہو تمہارے چھوٹے سرکار کے کمرے میں آتی جاتی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟"

"ہاں" — اُس نے بڑی مایوسی سے کہا۔ اُس کے ہاتھ جو اُس نے ہمارے آگے جوڑ رکھے تھے، اُس کی گود میں گر پڑے اور اُس نے سر جھکا کر کہا — "یہ درست ہے دھن وان!"

"کیا ان کی دوستی بملا نے کرائی ہے؟" — میں نے پوچھا — "ظاہر ہے تم اس میں خوش نہیں ہو گے، کیا بملا ان کی درپردہ دوستی کو پسند کرتی ہے؟"

"نہیں حجور!" — اُس نے جواب دیا — "بملا بے چاری بھی میری طرح مجبور ہے۔"

"تم نے اور بملا نے کماری کو کبھی نہیں بتایا تھا کہ اُس کا بیٹا تمہاری لڑکی کو خراب کر رہا ہے؟"

"جن کا دیا کھاتے ہیں اُن کے خلاف کیسے مُنہ کھول سکتے ہیں!" — اس نے جواب دیا۔

ہم نے اس ضمن میں اس سے اتنا زیادہ پوچھا کہ وہ پریشان ہو گیا اور مجبور ہو گیا کہ اصل بات بتا دے۔ اُس نے بتایا کہ مقتولہ کا بیٹا اوباش اور عیاش آدمی ہے۔ اس کے ہاتھوں کسی بھی مزارعہ یا ملازم کی ایسی لڑکی کی عزت محفوظ نہیں جس کی شکل و صورت اچھی ہو۔ اُس نے بملا کی بیٹی کو شادی سے پہلے ہی خراب کرنا شروع کر دیا تھا۔ بملا نے کماری سے کہا۔ کماری نے لڑکی کی شادی مُنشی کے بیٹے

کے ساتھ کر دی۔ وہ اسی جاگیر کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ مقتولہ کے بیٹے نے لڑکی کے خاوند کو حکم بھیجا کہ اپنی دلہن کو میرے پاس بھیجو۔ خاوند نے اپنے باپ (منشی) کو بتایا۔ منشی نے انکار کر دیا اور اپنے چھوٹے سرکار کی منت کی کہ وہ اس کی عزت کو یوں برباد نہ کرے۔ اس چھوٹے سرکار نے اپنے دو آدمی بھیجے جو لڑکی کو کھیتوں سے اٹھا کر قریبی جنگل میں لے گئے۔ مقتولہ کا بیٹا وہاں منتظر تھا۔ اس کے بعد منشی کی بہو اور بیٹے کی حیثیت زر خرید غلاموں کی سی ہو گئی۔

ہم نے اُس کو تسلی دی کہ اُس کی بہو کی عزت کی حفاظت کا انتظام کیا جائے گا مگر یہ شخص بہت زیادہ ڈرا ہوا تھا۔ ادھر ہم اُسے ڈراتے تھے کہ اُس نے جھوٹ بولا تو گرفتار ہوگا، اُدھر اسے چھوٹے سرکار کا ڈر تھا۔ اُس کی زبان کھل چکی تھی، بلکہ اُس کی زبان ہمارے قابو میں آگئی تھی۔ اب وہ کچھ چھپانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ مقتولہ کے بیٹے نے اپنے ساتھ دو جرائم پیشہ آدمی رکھے ہوئے، بلکہ پالے ہوئے ہیں۔ ان کے ڈر سے کوئی آدمی اس کے خلاف زبان نہیں کھول سکتا اور اس کا ہر حکم مانا جاتا ہے۔

"مجھ سے رقم لے جاتا ہے" — منشی نے بتایا — "اور یہ بھی بتا دیتا ہے کہ کون سے کھاتے میں ڈالوں۔ میں کھاتے میں ہیرا پھیری کرتا رہتا ہوں۔ اس کا کچھ انعام مجھے بھی مل جاتا ہے۔ یہ لڑکا شہر میں جا کر جوا کھیلتا ہے، طوائفوں کے ہاں محفلیں جماتا ہے اور یہاں تک کرتا ہے

کہ جاگیر کے کسی گاؤں میں چلا جاتا ہے اور وہاں جوئے کی محفل جما لیتا ہے۔"

چھوٹے سرکار کی بداخلاقی اور بدکرداری کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ جاگیردار کا بیٹا تھا، اکلوتا تھا، بے جا پیار میں پلا تھا۔ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اس میں ذرا سی بھی شرافت یا انسان دوستی ہو گی۔ ہمارے لئے اس کی کرتوت کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ اتنی بڑی جاگیر ہو، دولت کا دریا بہہ رہا ہو، بے بس، محتاج اور مفلس مزارعے اور نوکر چاکر ہوں تو انسان فرعون کیوں نہ بنے! مزارعوں اور نوکروں چاکروں کو بلکہ پوری قوم کو اسی لئے غریب اور فاقہ کش رکھا جاتا ہے کہ وہ محدودے ایک دولت مند اور جاگیردار گروہ کو اپنا "خدا" کہتے رہیں۔ ایک جاگیر کے چھوٹے سرکار پر ہی موقوف نہیں، مفلس ملک کی بڑی سرکار کی ذہنیت اور کرتوت بھی یہی ہوتی ہے۔

منشی نے ہمیں ان دونوں جرائم پیشہ آدمیوں کے نام بتا دیئے۔ اگر یہ جرائم پیشہ ہی تھے تو سب انسپکٹر مہندر پال کو ان سے واقفیت ہونی چاہیئے تھی۔ منشی نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ جاگیر کے ملازم نہیں، کبھی کبھی یہاں آتے ہیں۔ ہم نے مہندر پال کو بلایا اور منشی کو وہاں سے اُٹھا کر کمارہی کے سونے والے کمرے میں بھیج دیا۔

ایک بوتل، دو گلاس

مہندر پال کو دونوں بدمعاشوں کے نام بتا کر پوچھا کہ وہ انہیں جانتا ہے؟ اُس نے بتایا کہ وہ دونوں کو جانتا ہے اور دونوں سزا یافتہ ہیں اور تھانے کے ریکارڈ پر ہیں۔ ایک کو ایک بار اور دوسرے کو دو بار سزا ہو چکی ہے۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ دونوں اس جاگیر سے وابستہ ہیں؟" — ڈوبگن نے پوچھا۔

"مجھے کسی نے بتایا نہیں" — مہندر پال نے جواب دیا۔

"تم نے جاننے کی کوشش نہیں کی" — ڈوبگن نے کہا۔

"اگر میں جان بھی لیتا تو جاگیردارنی کے قتل کے ساتھ ان کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟" — مہندر پال نے پوچھا۔

"اس قتل کے ساتھ تمہارا بھی تعلق ہو سکتا ہے" — ڈوبگن نے انگریز حاکموں کے مخصوص لہجے میں کہا — "تم یہاں قانون اور انصاف کی قیمت وصول کرتے رہے ہو۔"

مہندر پال کچھ بولنے لگا تو میں بول پڑا — "تمہیں معلوم ہے کہ اس جاگیر کا ایک مینیجر بھی ہے جو قتل کی رات سے غائب ہے؟"

"مجھے سب بتاتے تھے کہ یہاں یہی ملازم ہیں جو موجود ہیں" —

اُس نے جواب دیا — "کسی نے بھی مینیجر کا نام نہیں لیا۔"

"ہمارا وقت ضائع نہ کرو" — ڈوبگن نے کہا — "ان دونوں جرائم پیشہ آدمیوں کو فوراً تھانے حاضر کرو اور انہیں وہاں بٹھائے رکھو۔۔۔ اور یاد رکھو، تم ان کے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ کوئی بات نہیں کرو گے۔ اگر مجھے ذرا سا بھی اشارہ مل گیا کہ تم نے کوئی گڑبڑ کی ہے تو میں تمہیں اس واردات میں اعانتِ جرم میں گرفتار کر لوں گا۔"

"میری مجبوریوں کو سمجھیں" — مہندر پال نے کہا۔

"مہندر پال!" — میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور ذرا مسکرا کر کہا — "جن مجبوریوں نے تمہارے ہاتھ باندھ دیئے تھے انہیں میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میں بھی سب انسپکٹر ہوں اور میں جانتا ہوں کہ یہ جگہ جہاں قتل کی واردات ہوتی ہے بڑی زرخیز ہے۔ تم یہ تو دیکھ لیتے کہ مقتولہ کی سوشل حیثیت کیا ہے۔۔۔۔ کیا تمہیں معلوم ہے قاتل کون ہے اور قتل کا باعث کیا ہے؟"

مہندر پال یک لخت پھٹ پڑا اور اُس نے اپنی بے گناہی کا واویلا کر دیا۔ قسمیں کھا کھا کر کہنے لگا کہ اُسے کچھ بھی معلوم نہیں۔

"جاؤ" — ڈوبگن نے کہا — "ان دو آدمیوں کو تھانے میں

نہ کرو

وہ کانپتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس نے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال لیا ہے" — ڈوبگن

نے کہا۔

ہمارے لئے معمہ یہ تھا کہ کماری کا بیٹا اُس کے قاتلوں کو پکڑنے میں دلچسپی کیوں نہیں لے رہا۔ کیا اس نے اپنے نوکروں چاکروں سے یہ کہہ رکھا ہے کہ وہ پولیس کو کچھ نہ بتائیں؟ کیا ماں بیٹے میں اختلاف اتنا سنگین تھا کہ بیٹا ماں کے قتل پر خوش تھا؟ اگر وہ خوش ہی تھا تو اُسے قاتلوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ مجھے خیال آیا کہ وہ نوکروں کا مُنہ اس لئے بند رکھنا چاہتا ہے کہ اُس کی اپنی کرتوت پر پردہ پڑا رہے ہمیں اس کی بدکاریوں اور عیاشیوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

س پہلو پر ہم اس امید پر توجہ دے رہے تھے کہ شاید اس راستے ہم اتل تک پہنچ سکیں۔ اس پر میں اور ڈوبگن متفق ہو گئے تھے کہ قاتل اہر سے نہیں آیا۔ اس گھر کا فرد ہے اور وہ کوئی ملازم ہی ہو سکتا تھا۔

صرف ایک ملازم غائب تھا اور وہ مینجر تھا۔ اس کے متعلق بملا بتا چکی تھی کہ کماری کے ساتھ اس کے مراسم تھے مگر یہاں یہ سوال سامنے آگیا کہ مقتولہ کے بیٹے نے کیوں کہا تھا کہ جاگیر کا کوئی مینجر نہیں؟ میں اس سے براہِ راست اس سوال کا جواب نہیں لینا چاہتا تھا۔ مینجر کی غیر حاضری بتاتی تھی کہ قاتل وہی ہے۔

میں نے منشی کو بلایا

"تم نے بہت سی نازک باتیں بتا دی ہیں" — میں نے کہا۔

"تم نے ہماری بہت مدد کی ہے۔ ہم تمہاری مدد کریں گے ... د...

باتیں بتا دو.... کماری کا اپنے بیٹے کے ساتھ کیا جھگڑا تھا؟"

"کوئی جھگڑا ضرور تھا" — اُس نے جواب دیا — "لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ جھگڑے کی وجہ کیا تھی۔"

"اور مینجر کے ساتھ تمہارے چھوٹے سرکار کے تعلقات کیسے تھے؟"

"چھوٹے سرکار کے پتا کے مرنے کے کچھ مہینے بعد مینجر کے ساتھ اس کے تعلقات بگڑتے بگڑتے بگڑنے لگتے تھے" — منشی نے جواب دیا۔ "مینجر یہاں کا کرتا دھرتا ہے۔ اُس نے پہلے مجھ سے کبھی نہیں پوچھا تھا کہ چھوٹے سرکار نے مجھ سے کوئی رقم لی ہے یا نہیں۔ تھوڑے عرصے سے اُس نے پوچھنا شروع کر دیا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ اسے ماں بہت پیسے دے دیتی ہے، تم نہ دیا کرو۔"

"تم پھر بھی دیتے رہے؟"

"دیتا رہا سرکار!" — اُس نے کہا — "میں مالکوں کی رقم مالکوں سے کس طرح چھپا سکتا ہوں۔"

"بملا تمہاری مالکن کی خاص ملازمہ رہی ہے" — میں نے پوچھا — "مینجر کے ساتھ بملا کے تعلقات کیسے تھے؟"

"دراصل جی!" — اُس نے کہا — "مالکن انہی دونوں کے قبضے میں تھی۔ مینجر بملا پر بہت مہربان ہے۔ کماری جی کی جو باتیں بملا جانتی ہے وہ اور کوئی نہیں جانتا۔"

"قتل کی رات تم یہاں تھے؟"

"نہیں حضور!" اس نے جواب دیا۔ "میں اپنے گھر تھا۔"

"تم جب صبح یہاں آئے تو تمہیں پتہ چلا ہوگا کہ کماری قتل ہو گئی ہے" — میں نے کہا — "اس وقت نوکر وغیرہ کیا باتیں کر رہے تھے؟"

"سب گھبرائے ہوئے اور ڈرے ہوئے تھے" — اس نے جواب دیا — "کسی نے بھی سوائے افسوس کے کوئی بات نہ کی۔ چھوٹے سرکار نے سب کو منع کر دیا تھا۔"

میں نے ایک شک کی بنا پر اس سے پوچھا کہ جن دو معاشوں کا اس نے ذکر کیا تھا، وہ بھی آ گئے ہوں گے۔ اس نے بتایا کہ دونوں چھوٹے سرکار کے ساتھ تھے۔

"جب چھوٹے سرکار تھانے رپورٹ لکھوانے گیا تو کون کون اس کے ساتھ گیا تھا؟"

"یہ دونوں آدمی ساتھ تھے .... اور جس نوکر نے سب سے پہلے لاش دیکھی تھی، وہ بھی ساتھ گیا تھا۔"

ہم نے منشی سے چند اور باتیں پوچھ کر اسے باہر بھیج دیا اور اس ملازم کو بلایا جس نے سب سے پہلے لاش دیکھی تھی۔ وہ اپنے روزمرہ کام کے لئے کمرے میں گیا تو اسے لاش پڑی نظر آئی۔ اس نے لاش کی وہی پوزیشن اور حالت بتائی جو سب انسپکٹر مہندر پال اور مقتولہ کا بیٹا بتا چکے تھے۔ نوکر کو ہم نے پوچھ گچھ اور پولیس کی مخصوص جرح کی چکی میں ڈالا تو اس سے ہم نے یہ اگلوا لیا کہ ٹی پائی پر شراب کی بوتل،

ایک گلاس اور روسٹ پرندے پلیٹوں میں پڑے تھے۔ ان میں زیادہ تر کھائے جا چکے تھے۔ ایک گلاس قالین پر گر پڑا تھا اور اس میں سے شراب قالین پر بہہ گئی تھی۔ ایک چھوٹی ٹی پائی پہلو کے بل گری ہوئی تھی۔ بڑی ٹی پائی پر ایش ٹرے رکھی تھی جس میں بہت سے بجھے ہوئے سگریٹ پڑے تھے۔ اس نوکر نے ہمارے پوچھنے پر یہ بھی بتایا کہ مقتولہ سگریٹ نہیں پیتی تھی۔

ایک سگریٹ پیکٹ اور ماچس بھی ٹی پائی پر پڑی تھی۔ سگریٹ قینچی کے تھے۔ اس زمانے میں قینچی برانڈ بہترین سگریٹوں میں شمار ہوتا تھا۔

"مینجر کون سا سگریٹ پیا کرتا تھا؟" — ڈوگن نے پوچھا۔

"قینچی" — نوکر نے جواب دیا۔

"رات دیر تک کماری کی حاضری میں کون رہا تھا؟"

"مجھے علم نہیں" — اس نے جواب دیا — "شاید ملا رہی ہو۔"

اس نوکر نے ہمیں بتایا کہ اس نے مقتولہ کے بیٹے کو جگایا اور بتایا کہ اس کی ماں کی لاش کمرے میں پڑی ہے۔ بیٹا کمرے میں گیا تو اس نے اس نوکر سے کہا کہ شراب کی بوتل، پلیٹیں اور گلاس اٹھا کر لے جاؤ اور گری ہوئی ٹی پائی سیدھی کر دو۔ نوکر نے کمرہ ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ اس کے بعد مقتولہ کا بیٹا تھانے گیا۔

"اس کے ساتھ جو دو آدمی تھانے گئے تھے، وہ رات یہیں کہیں

رہے تھے؟"

"نہیں" — اس نے جواب دیا — "چھوٹے سرکار باہر نکلے تو وہ دونوں آتے تھے۔"

"چھوٹے سرکار نے انہیں روک کر بتایا تھا کہ اس کی ماں مری پڑی ہے یا اُو اسی کے لیجے ہیں؟"

"میں نے چھوٹے سرکار کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے" — نوکر نے جواب دیا — "وہ باہر نکلا میں ساتھ تھا۔ باہر وہ دونوں کھڑے تھے۔ چھوٹے سرکار نے انہیں کہا — 'میں تھانے جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ چلو' — دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر ان میں سے ایک نے کہا — 'ہم شہر تک آپ کے ساتھ چلیں گے۔ آگے نہیں جائیں گے' — چھوٹے سرکار نے مجھے تھانے پہنچنے کو کہا۔ میں آگے آگے چلا گیا۔ میں بہت پہلے تھانے پہنچ گیا۔ چھوٹے سرکار گھوڑے پر آتے۔ ان کے ساتھ وہ دو آدمی نہیں تھے۔"

"تم نے یہ باتیں پہلے تھانیدار کو بتائی تھیں؟"

"مجھ سے انہوں نے بیان لیا ہی نہیں تھا" — اُس نے جواب دیا۔

مینیجر لاپتہ تھا

سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا۔ ہم نے اپنے عملے کو بلا کر کہا کہ

مقتولہ کے بیٹے، ہملا، منشی اور اس نوکر کو جس سے آخر میں بیان لیا تھا، اپنے ساتھ تھانے لے چلے۔ ہم دونوں اپنے گھوڑوں پر سوار ہوتے تو مقتولہ کے بیٹے نے شہزادوں کی طرح ہمارے سامنے آکر کہا کہ وہ اپنا گھوڑا تیار کرا لے۔ میں نے اُسے کہا کہ جس طرح ہمارا عملہ اور دوسرے لوگ پیدل جا رہے ہیں اسی طرح وہ بھی پیدل چلے۔ اُس نے کچھ ضد سی کی۔ میں نے اُسے کہا کہ اگر گھوڑے پر چلنا ہے تو ہتھکڑی میں چلنا ہوگا اور ہتھکڑی میرے ہاتھ میں ہوگی۔ میں اس کا دم خم اور جاگیرداری کا بل نکالنا چاہتا تھا۔

میں اور ڈوگن ڈاک بنگلے چلے گئے۔ ہم نے مینیجر کے گھر کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ وہ اسی قصبے کا رہنے والا تھا۔ غسل اور کھانے سے پہلے مینیجر کے گھر جانا ضروری سمجھا۔ تھانہ قریب ہی تھا۔ میں نے وہاں سے دو کانسٹیبل ساتھ لئے۔ دونوں قصبے سے واقف تھے۔ مینیجر کے گھر کے دروازے پر دستک دی تو ایک بوڑھے آدمی نے دروازہ کھولا۔ اُس سے مینیجر کے متعلق پوچھا تو اُس نے بتایا کہ وہ تو جاگیر پر ہوگا۔ میں اُسے ایک طرف کر کے اندر چلا گیا۔ کانسٹیبلوں سے کہا کہ وہ کمروں پر نظر رکھیں۔ وہ چھاپے اور تلاشی کے تربیت یافتہ تھے۔

مکان بہت بڑا نہیں تھا۔ کمرے چار یا پانچ تھے۔ گھر کے تمام افراد صحن میں نکل آئے۔ دو لالٹینوں کی روشنی کافی تھی۔ میرے پاس ٹارچ بھی تھی۔ میں نے تمام کمرے دیکھ ڈالے۔ کانسٹیبل چھت پر بھی گئے۔

بیت الخلاء اور غسل خانہ بھی دیکھا۔ مینجر کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بوڑھا ہندو اُس کا باپ تھا۔ وہ تو رونے پر آگیا تھا۔ ایک جوان عورت مینجر کی بیوی تھی اور ایک لڑکا مینجر کا بھائی۔ باقی سب بچے تھے جو سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے مینجر کا نام لے کر (جو مجھے یاد نہیں رہا) پوچھا کہ کہاں ہے۔

"اُس نے کیا کیا ہے؟" ___ بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا ___ "ہمیں معلوم ہے کہ اُس کے جاگیردار کی بیوی قتل ہو گئی ہے۔ میرا بیٹا قتل سے دو تین روز پہلے گھر آیا تھا۔ اس کے بعد وہ نہیں آیا۔"

میں نے بوڑھے کو الگ کر لیا اور اُسے کچھ ڈرایا کچھ بہلایا اور اُس سے بہت کچھ پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا بیٹا کئی کئی روز مسلسل جاگیر میں ہی رہتا ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ شام کو گھر آجاتا ہے۔ اب وہ بیس پچیس دنوں سے نہیں آیا۔ ہم مطمئن تھے کہ اُس کی مالکن ماری گئی ہے اس لئے پولیس کے ساتھ مصروف ہوگا۔

اُس کی بیوی کو الگ بٹھایا۔ اُس نے بھی وہی بتایا جو اُس کا سُسر بتا چکا تھا۔ وہ مجھ سے بار بار پوچھتی تھی کہ وہ جاگیر پہ نہیں ہے؟ اور وہ یہ بھی پوچھتی تھی کہ قتل کے ساتھ اُس کا تعلق تو نہیں؟

میں وہاں سے یہ رائے قائم کر کے نکلا کہ مینجر مفرور ہے اور قتل میں ملوث ہے۔ چوکیدار کو پتہ چل گیا تھا کہ یہاں پولیس آئی ہے۔ وہ اپنی ڈیوٹی کے مطابق باہر کھڑا تھا۔ اُس سے پوچھا کہ مینجر کو اُس نے یہاں کب

دیکھا تھا اور کیا ان دنوں وہ اُسے نظر آیا ہے؟ چوکیدار کی ڈیوٹی رات کو ہوا کرتی تھی۔ اُس نے مینجر کو نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اُسے تاکید کر دی کہ اس کے گھر پر نظر رکھے اور وہ نظر آجائے تو فوراً تھانے اطلاع دے۔

ایک کانسٹیبل کو بھیج کر نمبردار کو بلایا۔ وہ مینجر سے پوری طرح واقف تھا۔ اُس نے بھی اس کے باپ اور بیوی کے بیان کی تائید کی۔ میں نے اُسے کہا کہ اس کے گھر کی مخبری کرے اور وہ کہیں نظر آئے تو تھانے میں اطلاع پہنچا دے۔

کماری کے کمرے میں کون تھا؟

مشتبہ افراد سے تفتیش کا موزوں وقت آدھی رات کے بعد کا ہوتا ہے۔ میں نے ڈاک بنگلے جا کر غُسل کیا، کھانا کھایا اور کم و بیش دو گھنٹے آرام کیا۔ میں اور رڈوِگن جب تھانے پہنچے تو رات کا ایک بج چکا تھا۔ سب سے زیادہ بُری حالت چھوٹے سرکار کی تھی۔ اُسے کسی نے سونے نہیں دیا تھا۔ وہ عیاش اور پینے پلانے والا شہزادہ تھا، مگر اُس کی گھبراہٹ اور خوف کی وجہ ایک اور تھی۔ وہ یہ کہ اُس کے دونوں بدمعاش ساتھی تھانے میں موجود تھے اور اس ڈرامے کا ایک اور کردار بھی وہاں موجود تھا۔ یہ تھا اُس کا ماموں جس کے ساتھ اُس کا (مِملا کے بیان کے مطابق) جھگڑا ہوا تھا۔ وہ بھی اسی قصبے کا رہنے والا تھا۔ ہم نے اُسے بھی تھانے

بلوالیا تھا۔

ہمیں اب یہ شک ہونے لگا تھا کہ مقتولہ کو منیجر نے اور اُس کے بیٹے نے قتل کرایا ہے اور قتل کا باعث یہی ہو سکتا ہے کہ بیٹا جاگیر کا مالک بننا چاہتا ہے۔ ہم نے بیٹے کو دیکھ لیا تھا۔ اُس کی کرتوت سُن لی تھی۔ وہ گھٹیا قسم کا عیاش تھا۔ غریب نوکروں اور مزارعوں کی بیٹیوں کو خراب کرنے والے کا کوئی کردار نہیں ہو سکتا۔

مجھے بِملا سے کچھ باتوں کی وضاحت درکار تھی۔ اُسے سب سے پہلے اندر بُلایا۔ اُس سے اُس کی بیٹی اور مقتولہ کے بیٹے کے تعلقات کے متعلق پوچھا۔ جواب دینے سے پہلے اُس کے آنسو نکل آتے۔ اُس نے وہی بیان دیا جو مُنشی دے چکا تھا۔ اُس نے کہا —— "میں مجبور تھی۔ ایک بار چھوٹے سرکار کی ماں سے ذکر کیا۔ ماں نے اُسے لعنت ملامت کی تو بعد میں اس لڑکے نے مجھے باہر بُلا کر میری پٹائی کر دی۔ ماں بھی مجبور ہو گئی تھی۔"

"تم نے ایک دو باتیں ہم سے چھپالی تھیں" —— میں نے کہا —— "تم نے دیکھ لیا ہے کہ تمہارا چھوٹا سرکار ملزموں اور مشتبہ آدمیوں کے ساتھ باہر بیٹھا ہے۔ ہم کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔ تم بے خوف ہو کر سب کچھ بتا دو۔ قتل کی رات کماری کے ساتھ منیجر تھا؟"

"وہی تھا۔"

"تم کس وقت تک وہاں رہی؟"

"مجھے مالکن نے کہا تھا کہ چلی جاؤ۔ میں چلی آئی تھی۔"

"اس کے بعد تم نے منیجر کو نہیں دیکھا؟"

"نہیں!"

کیا ماں بدچلن تھی؟

اس سے چند اور باتیں پوچھ کر اُسے باہر بٹھایا اور مقتولہ کے بھائی کو اندر بُلایا۔ اُس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ اُس کی بہن قتل ہو گئی ہے، کیا اُسے کسی پر شک ہے؟

"یہ جگہ بہت ہی غلیظ ہے جہاں میرے باپ نے میری بہن کو بیاہ دیا تھا" —— اُس نے کہا —— "اتنے بوڑھے آدمی کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی کو صرف اس لئے بیاہا گیا تھا کہ بیٹی رانی بنے گی۔ اس جاگیر میں پاپ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آپ نے پوچھا ہے کہ مجھے کسی پر شک ہے؟ ..... اگر میں یہ کہوں کہ ماں کا قاتل اُس کا اپنا بیٹا ہے تو آپ یقین نہیں کریں گے اور یقین مجھے بھی نہیں آتا۔ یہ صرف شک ہے۔"

"شک کی وجہ کیا ہے؟"

"خاوند زندہ رہا تو میری بہن خوش رہی" —— اُس نے جواب دیا۔ "خاوند نے اُسے صحیح معنوں میں رانی بنا کے رکھا تھا مگر خاوند کے مرنے کے بعد میری بہن کا بیٹا ماں سے کھچنے لگا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ لڑکا بدکار ہے۔ یوں تو جسے بھی باپ دادا کی جاگیر اور نوکروں اور مزارعوں

کی رعایا مل جاتے، اُس کا اخلاق ختم ہو جاتا ہے لیکن اس لڑکے نے اپنے آپ کو شہر کے چھوٹے چھوٹے چرسیوں اور جواریوں کی سطح تک گرا دیا ہے۔ اس کی ماں بہت پریشان تھی۔ اسے روکتی رہتی تھی لیکن اُس کا اثر یہ ہُوا کہ اس پاپی نے اپنی ماں پر الزام عائد کر دیا کہ وہ بد چلن ہے۔"

"آپ کو کس طرح پتہ چلا؟"

"میں بہن سے ملنے کبھی کبھی جایا کرتا تھا" — اُس نے جواب دیا — "اُس کا بیٹا میرے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آتا تھا۔ بہن کے قتل سے کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ میں وہاں گیا تو اس چھوٹے سرکار نے مجھے اپنے کمرے میں لے جا کر کہا — 'اپنی بہن کو سمجھا لو یا اسے اپنے ساتھ لے جاؤ' — میں نے اُسے کہا کہ تمہیں جائداد کا وارث بننا ہے تو میں اپنی بہن سے کہہ دوں گا کہ ساری جائداد تمہارے نام کر دے، اور وہ کر دے گی، تم اس کے اکلوتے بیٹے ہو۔ اُس نے کہا۔ — 'جائداد کا سوال نہیں۔ تمہاری بہن کا چال چلن مشکوک ہو گیا ہے' — آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے کتنا غصہ آیا ہو گا۔ میں نے سوچا کہ شراب اور بدکاریوں نے اس کا دماغ بے کار کر دیا ہے۔ میں نے کہا — 'بدبخت! یہ میری بہن نہیں تیری ماں ہے' — اس کے بعد ہمارا آپس میں بہت جھگڑا ہُوا۔ اُس نے کہا — 'میں اسے موقع پر پکڑ کر تمہیں دکھاؤں گا لیکن تمہاری بہن تمہیں زندہ نہیں ملے گی، اور اُس کا یار بھی کسی کو

نظر نہیں آئے گا' — میں نے اپنی بہن سے کچھ نہ کہا۔ وہ پہلے ہی پریشان تھی۔ یہ بیٹا اُس کے لئے پریشانی کا باعث بنا ہُوا تھا۔"

"اُس نے کسی آدمی کا نام نہیں بتایا؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میں نے پوچھا بھی نہیں۔ اس کے بعد میں اس اطلاع پر وہاں گیا کہ میری بہن مر گئی ہے۔ میں نے اُس کے بیٹے سے پوچھا کہ کیسے مری ہے تو اُس نے بے رُخی سے کہا — 'جس طرح لوگ مرا کرتے ہیں' — جب مجھے پتہ چلا کہ وہ قتل ہُوئی ہے تو میں تھانیدار سے ملا۔ اُس سے پوچھا بھی اور اُسے بتایا بھی کہ قتل کی وجہ کیا ہو سکتی ہے لیکن سب انسپکٹر مہندر پال نے توجہ نہ دی۔ اتنا ہی کہا کہ وہ تفتیش کر رہا ہے۔ میں تین چار مرتبہ تھانیدار سے ملا۔ آخر اُس نے مجھے کہا کہ میں بھگوان نہیں کہ دو دنوں میں قاتل کو پکڑ لوں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ آئندہ تھانے آ کر مجھے پریشان نہ کرنا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ تھانیدار مجرموں پر پردہ ڈال رہا ہے۔ میں نے شہر کے دو تین معزز آدمیوں کے ساتھ بات کی تو وہ مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر میں پولیس کپتان کے پاس لے گئے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے دلچسپی لی اور آپ کو تفتیش کے لئے بھیجا ہے۔"

"اس جاگیر میں کوئی مینیجر بھی ہے؟"

"مینیجر ہے" — اُس نے جواب دیا — "بہت اچھا آدمی ہے۔ میں بہن کے قتل کے بعد اُسے تلاش کرتا رہا۔ اُس کے گھر سے بھی پتہ

کرتا رہا۔ یہی جواب ملا کہ جاگیر پر ہے۔"

"آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ اچھا آدمی ہے؟"

"میری بہن اُس کی بہت تعریف کیا کرتی تھی"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "وہ کہا کرتی تھی کہ صرف یہ ایک آدمی ہے جس پر میں بھروسہ کر سکتی ہوں۔"

یہ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ مقتولہ اور منیجر کے درپردہ مراسم تھے، اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ مقتولہ کے بیٹے کا اپنے ماموں کے ساتھ کیا جھگڑا تھا۔ یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ بیٹے کو ماں کی بدچلنی کا علم ہو گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ جو بیٹا غریب لوگوں کی بیٹیوں کی عزت خراب کرتا رہتا تھا، اُس کی اپنی ماں نے اپنی عزت اپنے ایک ملازم کے حوالے کر رکھی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ کیا ماں اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوئی؟

بدچلن ماں، بدکار بیٹا

مقتولہ کے بھائی کو ہم نے باہر بٹھا دیا اور چھوٹے سرکار کے دو جرائم پیشہ دوستوں میں سے ایک کو اندر بلایا۔ اس کلاس کے لوگوں کے ساتھ ہماری بات چیت ذرا مختلف ہوا کرتی تھی۔ یہ آدمی ایک بار کا سزا یافتہ تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ لسٹ الف کا بدمعاش ہے یا ب، کا؟ وہ چونکہ رجسٹرڈ بدمعاش نہیں تھا اس لئے اُس نے بڑے فخر

سے کہا۔۔۔ "نہیں حضور! میں الف اور ب، کا بدمعاش کیسے ہو سکتا ہوں۔"

"اب ہو جاؤ گے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "وعدہ معاف گواہ بننا پسند کرو گے یا دوسرے طریقے سے اقبالِ جرم کرو گے"۔۔۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اُسے کہا۔۔۔ "ایک ٹانگ اُوپر کر لو اور دونوں بازو کندھوں کی سیدھ میں پھیلا دو"۔۔۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ یہ لوگ چرسی اور شرابی تھے۔ ان کے جسموں میں طاقت نہیں ہوتی تھی۔ یہ تو رات بھر جاگا تھا۔ شام سے تھانے میں بیٹھا تھا اور سحر ہونے کو تھی۔ اُس سے ایک ٹانگ پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے پیچھے سے اُس کے منہ پر پوری طاقت سے تھپڑ مارا۔ وہ کئی قدم دُور دیوار کے ساتھ جا لگا اور گرا۔ میں نے اُس کے بال مٹھی میں لے کر کھینچے تو وہ چیخ مار کر اُٹھا۔۔۔ "ایک ٹانگ پر کھڑے ہو جاؤ"۔۔۔ اُس نے ایک ٹانگ پر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ میں نے کہا۔۔۔ "اب بتاؤ کیا ارادہ ہے۔ تم چاہتے ہو گے کہ میں سوال جواب کروں گا اور تم مجھے بیوقوف بنا لو گے۔"

اُس سے ایک ٹانگ پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اُس کی کلائی پکڑ کر بازو مروڑ دیا اور اُسے پیٹ کے بل فرش پر گرا دیا۔ ایک پاؤں اُس کی پیٹھ پر رکھا اور اُس کا مروڑا ہوا بازو اُوپر کو کھینچا۔ یہ اذیت قابلِ برداشت نہیں ہوتی۔ میں نے کہا۔۔۔ "میں جانتا ہوں تم کونسی زبان سمجھتے ہو۔ بولو، میں کیا پوچھ رہا ہوں۔ ہم نے پوری شہادت حاصل کر کے تمہیں پکڑا ہے۔"

ہمیں چونکہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ دونوں بدمعاش قتل کی واردات میں ملوث ہیں اس لئے ہم پوچھ گچھ اور جرح میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ڈوگمن اُٹھا اور مجھے پرے ہٹا کر اُس نے اس آدمی کے ساتھ اپنا ایک کرتب دکھایا۔ اس کا اثر اچھا ہُوا۔ یہ آدمی کراہتے ہُوئے بولا ___ "میں آپ کا گواہ بنوں گا۔"

ہم نے اُسے کرسی پہ بٹھا دیا۔ نیند اور اذیت سے وہ مرا جا رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ پہلے سارا واقعہ سناؤ، پھر وعدہ معاف گواہ بنائیں گے۔ دراصل اسے وعدہ معاف گواہ بنانے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اُس نے بڑا لمبا بیان دیا۔ آپ کی دلچسپی کے لئے اس کا وہی حصّہ سُنا دینا کافی ہوگا جو اس واردات سے متعلق ہے۔ یہ دونوں عادی مجرم مقتولہ کے بیٹے کے وظیفہ خوار غنڈے تھے۔ اُس کی پسند کی لڑکیوں کو اُٹھا کر یا دھمکیاں یا لالچ دے کر اس لڑکے تک پہنچانا اور ان لڑکیوں کے لواحقین کو دہشت زدہ کئے رکھنا ان دونوں کا کام تھا۔ مقتولہ کا بیٹا شہر میں جُوا کھیلنے آیا کرتا تھا۔ یہ دونوں اُس کے محافظ ہوتے تھے۔ جاگیر پہ یہ دونوں تمام نوکروں، مزارعوں اور دیگر لوگوں کے لئے دہشت بنے ہوتے تھے۔

"ایک روز مقتولہ کے بیٹے نے ہمیں کہا کہ وہ اپنی ماں کو اور منیجر کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ ان کے ناجائز مراسم ہیں لیکن وہ

انہیں موقع پہ پکڑ کر قتل کرنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں گھبرا گئے کہ بیٹا اپنی ماں کو قتل کر رہا ہے لیکن یہ شخص اتنی زیادہ پیتا ہے اور بدکاری میں اتنا زیادہ ڈوب گیا ہے کہ اسے اپنے پرائے کی کوئی تمیز نہیں رہی۔ ہم پیشہ ور ہیں۔ ہمیں مُنہ مانگی رقم اور عیاشی کا سامان مل جاتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا تھا کہ یار، یہ کام مجھ سے تو نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی آمادہ نظر نہیں آتا تھا....

"قتل کی شام ہم شہر میں تھے۔ (یہ شہر نہیں چھوٹا سا قصبہ تھا)۔ ایک گانے والی کو بلا رکھا تھا۔ چھوٹے سرکار نے ہر روز کی طرح شراب چڑھا رکھی تھی۔ ہم دونوں بھی نشے میں تھے۔ ہم اسی حالت میں واپس آ گئے۔ چھوٹے سرکار نے کہا کہ میرے ساتھ چلو۔ وہاں سے واپس آ جانا یا وہیں سو جانا۔ ہم اس کے ساتھ گئے۔ مکان میں داخل ہوتے تو وہاں کوئی نوکر نہیں تھا۔ اندر کسی کمرے میں روشنی تھی۔ چھوٹے سرکار اُدھر گیا اور واپس آ کر کہا ___ دونوں شکار موجود ہیں.... ابھی چلو ___ نہ وہ کچھ سوچ سکا نہ ہم سوچ سکے۔ یہ نشے کا اثر تھا۔ ہم چھوٹے سرکار کے پیچھے پیچھے گئے۔ اُس نے رُک کر کہا ___ گلا گھونٹنا، چاقو نہ چلانا"....

"اتنے بڑے محل جیسے مکان کے کمروں اور برآمدوں سے گزر کر چھوٹے سرکار نے ایک بند دروازہ کھولا، اور وہ اندر چلا گیا۔ ہم اُس کے پیچھے پیچھے اندر گئے۔ کماری اور منیجر ایک صوفے پہ اس طرح بیٹھے تھے کہ منیجر کا بازو کماری کے کندھوں پہ تھا اور کماری اُس کے ساتھ لگی

ہوتی تھی۔ مینیجر کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا۔ ہمیں دیکھ کر دونوں گھبرا کر اُٹھے۔ چھوٹے سرکار نے دوڑ کر ماں کی گردن اپنے ہاتھوں میں لے لی اور بولا ـــــ اِسے (مینیجر کو) بھی ختم کر دو۔ میرا ساتھی مینیجر کی طرف بڑھا۔ مینیجر ہٹا۔ میں نے پیچھے سے اُسے پکڑ لیا۔ اُس کے ہاتھ سے گلاس گر پڑا۔ کچھ دھینگا مُشتی ہوئی۔ آخر میرے ساتھی نے مینیجر کی گردن پکڑ لی۔

"دونوں ختم ہو گئے تو ہمارا نشہ اُترنے لگا۔ ہم نے پہلے کبھی قتل کی واردات نہیں کی تھی۔ ہم نے چھوٹے سرکار سے پوچھا کہ اب کیا کریں؟ اُس نے نشے سے جھومتے ہوئے کہا ـــــ 'پولیس میری جیب میں ہے' ـــــ اُس نے ماں کی لاش کو ٹھُڈ مار کر کہا ـــــ 'اِسے یہیں پڑا رہنے دو اور اسے (مینیجر کو) اُٹھا کر لے جاؤ۔ میں تمہیں کدال دیتا ہوں۔ کہیں دُور دفن کر دینا..... اور صبح اپنا انعام لینے آ جانا' ـــــ وہ کہیں سے ایک کدال اُٹھا لایا۔ ہم نے لاش باہر نکالی۔ اُس وقت چھوٹے سرکار نے کہا ـــــ 'میرے گھوڑے پر لاد کر لے جاؤ' ـــــ وہ گھوڑا لے آیا۔ ہم نے لاش گھوڑے پر ڈالی اور جنگل میں ایسی جگہ دفن کر دی جہاں پہلے ہی گڑھا تھا۔ ہم نے واپس جا کر گھوڑا چھوٹے سرکار کو دیا اور شہر آ گئے.....

"اگلی صبح آنکھ کھُلی تو میرا دل سخت گھبرایا۔ اُس وقت نشہ پوری طرح اُتر چکا تھا۔ اپنے ساتھی کو جا کر جگایا۔ وہ بھی گھبرایا ہُوا تھا۔ ہم چھوٹے سرکار کے پاس گئے۔ وہ پوری طرح اطمینان میں تھا۔ اُس نے

کہا کہ وہ تھانے یہ رپورٹ دینے جا رہا ہے کہ اُس کی ماں کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ وہ ہمیں ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن ہم تھانے تک نہ گئے۔ چھوٹے سرکار نے ہمیں تین تین ہزار روپیہ دیا اور یہ بھی کہا کہ یہ معاملہ رفع دفع ہو جائے تو وہ ہمیں کسی بڑے شہر لے جا کر بہت عیش کرائے گا۔ بعد میں اُس نے ہمیں بتایا کہ اُس نے تھانیدار کو قابو میں لے لیا ہے اور اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔"

پانچ ہزار، دس ہزار

اس سے ہم نے اپنے مطلب کی بہت سی باتیں معلوم کر لیں اور اسے حوالات میں بند کرا دیا، پھر اس کے ساتھی کو بُلایا۔ یہ دو بار کا سزا یافتہ تھا۔ اسے ہم نے کہا کہ اس کا ساتھی وعدہ معاف گواہ بننے کے لئے اقبالی ہو چکا ہے۔ اسے ہم نے کچھ باتیں سُنا بھی دیں۔ یہ دونوں چونکہ معمولی سے جرائم کے عادی تھے اس لئے وہ قتل جیسے بھیانک جُرم کو ہضم نہیں کر سکتے تھے۔ اس آدمی نے مِنّت کی کہ وعدہ معاف گواہ اُسے بنایا جائے۔ ہم نے اُسے جھوٹا وعدہ دیا۔ اُس نے اپنے ساتھی کی تائید میں اقبالی بیان دے دیا۔ اس کے بعد ہم نے اپنا مقدمہ مضبوط کرنے کے لئے اُس سے جو کچھ پوچھا اُس نے بتا دیا۔ اسے بھی حوالات بند کرا دیا۔

صبح طلوع ہو رہی تھی جب ہم نے چھوٹے سرکار کو اندر بلایا۔ اُس نے رات جاگ کر، شراب کے بغیر، اعصابی کشمکش میں گزاری تھی۔ وہ ہمارے کمرے میں داخل ہوا تو اُس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور سر ڈول رہا تھا۔ میرے اشارے پر وہ کرسی پر گر پڑنے کے انداز سے بیٹھ گیا۔ اُس نے جیب سے سگریٹ پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں رکھا۔ ڈوگن نے اُس کے مُنہ سے سگریٹ چھین کر پرے پھینک دیا اور کہا —"تم تھانے میں ہو، اپنی جاگیر میں نہیں"۔

"تم نے اپنے دو ساتھیوں کو حوالات میں بند ہوتے دیکھ لیا ہو گا"— میں نے اُسے کہا —"اپنا جرم خود ہی بیان کر دو۔ تم نے یہ بھی دیکھ لیا ہو گا کہ ہم نے تھانے میں اُنہی لوگوں کو بلایا ہے جو تمہارے ساتھ جرم میں شریک تھے اور جو لوگ تمہارا جرم ثابت کر چکے ہیں۔ ہمیں تمہارے بیان کی ضرورت نہیں۔ جو کہنا ہے عدالت میں کہہ دینا اور پھانسی کی سزا پا لینا۔ یہاں بیان دے دو گے تو ہم تمہیں پھانسی سے بچا لیں گے"۔

"بیان کی بجائے آپ کچھ اور مانگیں"— اُس نے نیند اور تھکن سے ماری ہوئی آواز میں کہا —"جتنا مانگیں گے اتنا نقد دوں گا"۔

"جتنی رقم تھانیدار کو دی ہے اس سے دُگنی دو گے؟"— میں نے پوچھا۔

"منظور ہے"— اُس کی آواز میں جان آگئی۔

"اُسے کیا دیا تھا؟"

"پانچ ہزار"— (اُس زمانے کا پانچ ہزار آج کے ایک لاکھ کے برابر تھا)۔

"ہمیں دس ہزار منظور ہے"— ڈوگن نے کہا —"لیکن ہمیں یہ بتا دو کہ تم نے یہ جرم کس طرح کیا ہے"— اس لڑکے میں عقل کی خاصی کمی تھی۔ اُس نے اقبالی بیان دے دیا۔ ہم اس دوران اُس پر سوال بھی کرتے رہے اور وہ برخورداری سے جواب دیتا رہا۔ اُسے اپنی ماں کے چال چلن پر صرف شبہ ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ ٹھیک نہیں۔ اُسے شبہ اپنے باپ کی زندگی میں ہو گیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اُس کی ماں بدچلنی میں نڈر اور بے احتیاط ہو گئی تھی۔

اُسی روز دونوں بدمعاشوں کی نشاندہی پر مینجر کی لاش برآمد کر لی گئی۔

تینوں نے مجسٹریٹ کو اپنے اقبالی بیان قلمبند کرا دیئے۔ مقتولہ کے بیٹے کے چچا نے بڑا قابل وکیل کیا تھا لیکن ہم نے جس محنت سے مقدمہ تیار کیا اور جو شہادت فراہم کی تھی اسے اُس کا وکیل جھٹلا نہ سکا، حالانکہ وکیل کے کہنے پر تینوں ملزم سیشن کورٹ میں اپنے اقبالی بیانوں سے منحرف ہو گئے تھے اور ہم نے کسی کو

وعدہ معاف گواہ بھی نہیں بنایا تھا۔ مقتولہ کے بیٹے اور اس کے اُس ساتھی کو جس نے بینجر کا گلا گھونٹا تھا، سزائے موت ہوئی اور تیسرے ساتھی کو عمر قید۔ سب انسپکٹر مہندر پال کی الگ انکوائری ہوئی۔ اسے نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔

وہ طلاق سے ڈرتی تھی

بیوی لاپتہ ہوگئی تو اُس کا خاوند اور سُسر تین دن بعد میرے پاس آئے۔ میں نے پہلا سوال یہ کیا کہ وہ تین دن کیا کرتے رہے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے طور پر اِدھر اُدھر ڈھونڈتے رہے۔ وہ اگلی رات بھی واپس نہ آئی تو جمال شاہ کے پاس گئے۔ اُس نے اپنا حساب کتاب دیکھ اور جوڑ کر بتایا کہ لڑکی اپنی مرضی سے نکل گئی ہے اور واپس نہیں آئے گی۔ اگر اُسے زبردستی واپس لانے کی کوشش کی گئی تو وہ زندہ نہیں رہے گی اور لڑکی کے خاوند کو مالی اور جسمانی نقصان ہوگا۔

جمال شاہ کا تعارف یہ ہے کہ وہ سیّد نہیں تھا، نہ اپنے نام کے ساتھ سیّد لکھتا تھا۔ وہ پیر اور مُرشد بھی نہیں تھا، نہ پیری مریدی کا دعویٰ کرتا تھا۔ وہ عالم فاضل اور مولوی وغیرہ بھی نہیں تھا۔ چھوٹے سے اس قصبے سے کوئی دو فرلانگ ہٹ کر اُس کی بہت بڑی حویلی تھی۔ اس کے ساتھ اُس کا اپنا سبزیوں کا باغ تھا۔ اس میں رہٹ لگا ہوا تھا۔

حویلی کے دائیں اور بائیں دس بارہ کچے مکان تھے۔ ان میں غریب سے کسان اور مزدور رہتے تھے۔ وہیں سے جو کھیتیاں شروع ہوتی تھیں وہ جمال شاہ کی تھیں۔ وہ درمیانہ درجے کا زمیندار تھا۔ اُس کی ذات کچھ اور تھی لیکن لوگوں نے اُسے شاہ بنا دیا تھا۔ سُنا تھا کہ جوانی میں اُس نے دعویٰ کیا تھا کہ اُس نے کسی پردیسی فقیر کی مدد اور خدمت کی تھی۔ فقیر نے خوش ہو کر اُسے اپنے علم کا ایک ایسا راز دے دیا تھا جس سے غیب کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے اور بگڑی تقدیر سنور سکتی ہے۔

مجھے اس قصبے کے تھانے کا چارج لئے ابھی چار مہینے گزر رہے تھے۔ اُس وقت جمال شاہ کی عمر پچاس کے قریب پہنچ گئی تھی اور وہ عامل اور شاہ کی حیثیت سے دُور دُور تک مشہور ہو گیا تھا۔ اُس کے متعلق مجھے اطلاع دینے والے بھی کہتے تھے کہ اُس کے پاس غیب کی کوئی طاقت ہے۔ میں اس کے متعلق کوئی رائے نہیں دوں گا کہ اُس کے پاس کوئی غیبی طاقت تھی یا نہیں، میں اس نظریئے کا قائل ہوں کہ تعلیم کی کمی اور معاشی بدحالی سے لوگ اپنے آپ کو اتنا کمزور سمجھتے ہیں کہ جمال شاہ جیسے لوگوں کی غیبی قوّت کو برحق تسلیم کر لیتے ہیں۔ انہی پسماندہ اور بے علم لوگوں نے جمال الدین کو جمال شاہ بنا دیا تھا۔

اس جمال شاہ نے گمشدہ لڑکی کے متعلق اُس کے خاوند اور سُسر کو بتایا کہ لڑکی اپنی مرضی سے گئی ہے اور واپس نہیں آئے گی۔ یہ دونوں ایک ہندو جوتشی کے پاس چلے گئے۔ جوتشی نے اپنی فیس لے کر اور

سلیٹ پر حساب کر کے انہیں بتایا کہ لڑکی کا ستارہ کسی چکر میں آ گیا ہے لیکن اسی گھر میں واپس آتا نظر آ رہا ہے۔ بڑی مسجد کے خطیب صاحب بھی تعویذ لکھا کرتے اور غیب کا حال بتایا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی فیس لے کر بتایا کہ کالا مُرغ ذبح کر کے اس کا گوشت کوٹھے پر پھینک دیا جائے۔ انہوں نے گھر کے دروازے کے ساتھ باندھنے کے لئے تعویذ بھی دیا اور کہا کہ یہ تعویذ بھٹکی ہوئی رُوح کو واپس لے آئے گا۔

ان میں سے کوئی بھی انہیں نہ بتا سکا کہ لڑکی ہے کہاں۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے باپ بیٹا تھانے میں آئے۔ میرے پاس غیب کا حال معلوم کرنے کی کوئی طاقت نہیں تھی، نہ ہی میں رمل فال اور تعویذ نویسی کے علم سے واقفیت رکھتا تھا۔ مجھے انہی لوگوں (لڑکی کے سُسرال اور میکے) کے سینوں سے کچھ باتیں نکال کر یہ معلوم کرنا تھا کہ لڑکی گھر سے چلی گئی ہے تو کیوں گئی ہے یا کیا لڑکی اغوا ہوئی ہے؟ یہ لوگ تین دن ضائع کر چکے تھے۔ اگر لڑکی خود گئی یا اغوا ہوئی ہے تو اس عرصے میں ہندوستان کے دُور دراز گوشے میں پہنچ چکی ہو گی اور یہ لوگ الزام عائد کریں گے کہ پولیس لڑکی کا سراغ نہیں لگا سکی۔

شادی شدہ جوان عورت کی گمشدگی کے متعلق دو چار باتیں ذہن میں رکھ لیں۔ اگر وہ شادی کے فوراً بعد غائب ہو گئی ہو تو اُس کی دو وجوہات ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اُس کی شادی اُس کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے اور وہ جس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی، اُس کے ساتھ نکل گئی

ہے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جنہیں اُس کے رشتے سے مایوس کیا گیا تھا ان میں سے کسی نے اُسے اغوا کر لیا ہے یا وہ بردہ فروشوں کے ہاتھ لگ گئی ہے۔

اگر شادی شدہ عورت شادی کے چند سال بعد لاپتہ ہوئی ہے تو ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ خاوند سے مطمئن نہ ہو سکی اور کسی بہتر آدمی کے ساتھ نکل گئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سسرال کا سلوک بہت بُرا تھا اور وہ ہر وقت کی بدسلوکی اور طعنہ زنی سے تنگ آ کر گھر سے نکل گئی اور اپنے ماں باپ پر بوجھ بننے کی بجائے نہر یا دریا میں کود گئی۔ اگر وہ چالیس سال کی عمر کے بعد لاپتہ ہوتی ہے تو یہ ذہنی خرابی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس عمر میں اکثر بعض عورتوں کو اندرونی خرابی یا تبدیلی کے باعث ذہنی عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس کے تحت بعض عورتیں گھروں سے بھاگتی ہیں لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کہاں جا رہی ہیں۔

انسانی فطرت بڑی گہری اور پیچیدہ ہے۔ ہم نے آدھی درجن بچوں کی ماؤں کو بھی اپنے آشناؤں کے ساتھ بھاگتے دیکھا ہے۔ بچوں کے باپوں کو بھی ہم نے کسی دوسری عورت کی خاطر اپنی بیویوں کو طلاق دیتے دیکھا ہے۔ اب اس عورت کی گمشدگی کی رپورٹ آئی تو میں نے اُس کی عمر پوچھی اور یہ بھی کہ شادی کب ہوئی تھی۔ مجھے جواب ملا کہ اُس کی عمر اکیس سال کے لگ بھگ ہے اور شادی ہوئے دو سال گزرے ہیں۔ اُس کی شکل و صورت کے متعلق بتایا گیا کہ خوبصورت ہے اور اُس کا قد بُت تو بہت ہی اچھا ہے۔ میں نے اُس کے خاوند کو غور سے دیکھا

کہ وہ کتنا کچھ خوبصورت ہے۔ وہ اگر خوبصورت نہیں تو بدصورت بھی نہیں تھا۔ اُس کا رنگ گندمی اور جسم توانا لگتا تھا۔ ظاہری طور پر مجھے اُس میں کوئی ایسا نقص نظر نہیں آ رہا تھا۔

لڑکی ہنسی مذاق کی عادی اور شوخ تھی

ان کی اطلاع کے مطابق لڑکی خاوند کے کمرے میں سوئی تھی۔ صبح غائب پائی گئی۔ کمرے کا دروازہ جو رات کو اندر سے بند تھا، کھلا تھا اور حویلی کا بڑا دروازہ بھی کھلا پایا گیا۔ بیت الخلا چھت پر تھا۔ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ اُس کے میکے گھر جا کر پتہ کیا جو دوسرے محلے میں تھا۔ اُس کے ماں باپ سُن کر پریشان ہو گئے۔ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ پھر یہ لوگ عاملوں اور جوتشیوں کے دروازے کھٹکھٹانے لگے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کوشش میں تھے کہ در پردہ سراغ مل جائے کہ لڑکی کہاں ہے اور وہاں سے چوری چھپے لے آئیں۔ جوان بیوی کی گمشدگی سسرال، میکے اور خصوصاً خاوند کے لئے بے عزتی کا باعث ہوتی ہے۔ وہ مایوس ہو کر میرے پاس آئے تھے۔

میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ لڑکی اغوا نہیں ہوئی اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہے اور اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ وہ ان لوگوں سے یا صرف خاوند سے تنگ تھی۔ لڑکی

کے چال چلن اور اُس کے سسرال کے سلوک کے متعلق مجھے اپنے ذرائع سے معلومات مل جاتی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کچھ نقدی اور زیورات بھی ساتھ لے گئی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ کچھ بھی نہیں لے گئی۔ وہ انہی کپڑوں میں گئی ہے جو اُس نے رات پہن رکھے تھے۔

یہ متوسط طبقے کے مسلمان تھے۔ میں نے کیس رجسٹر کرنے سے پہلے ضروری سمجھا کہ ان سے مزید معلومات اور گھر کے حالات معلوم کر لوں تاکہ ان کی بے عزتی نہ ہو۔ لڑکی کو کوئی اُٹھا کر تو نہیں لے گیا تھا۔ میں نے لڑکی کے خاوند کو باہر بھیج دیا اور خاوند کے باپ سے کہا کہ وہ مجھ سے کوئی بات خواہ وہ کتنی ہی معمولی ہو، چھپانے کی کوشش نہ کرے۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ وہ کچھ سراغ دے دے تاکہ میں درپردہ لڑکی کو واپس لے آؤں۔

"میاں بیوی کے تعلقات کیسے تھے؟" — میں نے پُوچھا۔

"بہت اچھے" — اُس نے جواب دیا — "لڑکی میرے بیٹے کو بہت چاہتی تھی۔"

"شادی سے پہلے بھی چاہتی تھی؟"

"اس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔"

"شادی سے پہلے لڑکی کسی اور کو تو نہیں چاہتی تھی؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میرے کان میں کبھی ایسی بات نہیں پڑی۔"

"لڑکا لڑکی کو پسند کرتا تھا؟"

"ایسی خوبصورت لڑکی کو وہ کیوں پسند نہیں کرتا ہوگا۔"

"لڑکی سادہ طبیعت کی ہے؟ شوخ ہے؟ گھر رہنے کی عادی ہے یا باہر پھرنا پسند کرتی ہے؟"

اُس نے ذرا سوچ کر جواب دیا — "ایسی سادہ بھی نہیں۔ ہنسی مذاق کی عادی ہے۔ شوخ بھی ہے۔ گھر میں ہر وقت بند رہنا بھی پسند نہیں کرتی۔"

"اور آپ کا بیٹا کیسا ہے؟" — میں نے پوچھا — "وہ اپنی بیوی کی یہ عادتیں پسند کرتا تھا؟"

"میرے سامنے اُس نے اپنی بیوی کو کبھی روکا ٹوکا نہیں تھا" — اُس نے جواب دیا — "وہ خود زندہ دل لڑکا ہے۔"

"کوئی بچہ؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "ابھی کوئی بچہ نہیں اور کوئی آثار بھی نہیں۔"

"آپ کی بیوی کا بہو کے ساتھ کیسا سلوک ہے؟"

"کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہُوا" — اس نے جواب دیا — "اس کا مطلب یہ ہے کہ میری بیوی کا اپنی بہو کے ساتھ سلوک اچھا ہے۔"

"اور اس کا مطلب کچھ اور بھی ہو سکتا ہے" — میں نے ذرا ترشی سے کہا — "ان کا لڑائی جھگڑا نہ ہونے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

ساس کا سلوک اچھا نہیں تھا اور لڑکی خاموشی سے برداشت کرتی رہی۔ آخر تنگ آکر گھر سے نکل گئی۔ میں آپ سے صاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ آپ لوگوں کا سلوک لڑکی کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ اگر آپ سچ بولیں گے تو میں آپ کو سزا نہیں دوں گا۔ میں وجہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ لڑکی گھر سے کیوں گئی۔ وجہ معلوم ہو جاتے تو تلاش آسان ہو جاتی ہے ..... آپ مجھے صرف یہ بتا دیں کہ جس رات لڑکی لاپتہ ہوئی اُس روز گھر میں ساس بہو کا یا میاں بیوی کا آپس میں جھگڑا ہوا تھا؟"

"کوئی جھگڑا نہیں ہوا" ـــ اُس نے جواب دیا۔

"آپ کسی پر شک کا اظہار کر سکتے ہیں کہ اُس نے لڑکی کو ورغلایا یا اغوا کیا ہو گا؟"

"مجھے کسی پر شک نہیں۔"

"لڑکی کے والدین کیسے لوگ ہیں؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "اُن کے ساتھ آپ کے تعلقات کشیدہ تو نہیں؟ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ انہوں نے آپ کو پریشان کرنے کے لئے لڑکی کو چھپا لیا ہو؟"

"لڑکی کا باپ شریف اور بھلے مانس ہے" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "لڑکی کی ماں اچھی عورت نہیں۔ بہت چالاک اور مکار ہے۔"

مجھے کچھ ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔

خاوند کا رنگ پیلا پڑ گیا

میں نے جب اُس سے لڑکی کی ماں کی چالاکی اور مکاری کی تفصیل پوچھی تو پتہ چلا کہ اُس کے ساتھ اِن لوگوں کا کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا، نہ کبھی ایسا ہوا ہے کہ لڑکی اپنے میکے گئی تو ماں نے اُسے سُسرال یا خاوند کی خواہش پر آنے نہ دیا ہو اور اپنی خواہش کو مقدم رکھا ہو۔ میں صرف یہ سمجھ سکا کہ یہ آدمی لڑکی کی ماں کو پسند نہیں کرتا۔ خاوندوں اور بیویوں کے والدین کے آپس کے تعلقات عموماً کشیدہ رہا کرتے ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ گمشدہ بیوی کے اور اُس کے خاوند کے والدین کے درمیان کوئی سنگین قسم کی دشمنی تھی یا نہیں۔ مجھے کوئی ایسی دشمنی نظر نہ آئی کہ لڑکی کو اُس کے اپنے والدین نے غائب کر دیا ہو۔ میں نے ایسے کیس دیکھے ہیں کہ لڑکی کو اپنے والدین نے غائب کر کے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ لڑکی کے سُسرال اُس پر ظلم و تشدد کرتے رہتے ہیں اور انہوں نے لڑکی کو کہیں غائب کر دیا ہے۔ یہاں مجھے ایسی کوئی بات نظر نہ آئی مگر میں نے دیکھا کہ یہ آدمی اپنے وقار بلکہ اپنی ناک کے تحفظ کی خاطر مجھے اندر کی صحیح باتیں نہیں بتا رہا تھا۔

اُسے باہر بھیج کر لڑکی کے خاوند کو اندر بلایا۔ اس سے بھی میں نے

وہی کچھ پوچھا جو اُس کے باپ سے پوچھ چکا تھا۔ اُس نے بھی اپنے باپ سے ملتے جلتے جواب دیئے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ شادی سے پہلے لڑکی کے ساتھ اُس کی بات چیت تھی؟ اور کیا لڑکی خوش تھی کہ اُس کی شادی اِس کے ساتھ ہو رہی ہے؟

"میں نے اُسے شادی سے پہلے صرف دیکھا تھا" — اُس نے جواب دیا — "شادی کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ آپ محلے میں کسی سے پوچھ لیں، وہ میرے ساتھ دلی محبت کرتی ہے۔"

"کیا تم بھی اُس کے ساتھ دلی محبت کرتے تھے؟"

"جی ہاں!" — اُس نے جواب دیا۔

"وہ ذہنی طور پر نارمل تھی؟"

"بالکل ٹھیک تھی۔"

"تم دل سے چاہتے ہو کہ تمہیں بیوی واپس مل جائے؟"

"کیوں نہیں جی؟"

"تمہاری ماں کا اُس کے ساتھ سلوک کیسا تھا؟"

"ایسا بُرا تو نہیں تھا کہ وہ گھر سے بھاگ جاتی" — اُس نے جواب دیا — "کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہُوا تھا۔"

"لڑکی اتنی شوخ اور ہنسی مذاق کی شوقین تھی" — میں نے کہا — "ایسی لڑکی در پردہ خراب بھی ہو سکتی ہے۔ وہ باہر گھومنے پھرنے

کی بھی عادی تھی۔ کیا تم نے اُسے کبھی روکا نہیں تھا؟"

"نہیں"۔

"دیکھو میاں!" — میں نے کہا — "اُس کا دِل کہیں اور پھنس گیا تھا اور تمہیں اس کی خبر تھی۔ اسی پر تمہارا اُس کے ساتھ جھگڑا رہتا تھا۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ لڑکی کو کوئی اُٹھا کر نہیں لے گیا، وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ مجھے بتا دو کہ وہ آدمی کون ہے۔"

یہ میں نے ہوا میں تیر چلایا تھا۔ اس جواں سال آدمی کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ خاوند کے لئے یہ چوٹ ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ اس پر خاوند قتل بھی کر دیا کرتے ہیں اور خودکشی بھی۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میرے کئی بار پوچھنے کے باوجود اُس کے مُنہ سے کوئی جواب نہ نکلا۔ صرف ایک بار اُس نے سر ہلا کر اور گردن کو ذرا سا خم دے کر حیرت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد میں نے اس سے بہت کچھ پوچھا۔ اُس کی جسمانی اور نفسیاتی کیفیت معلوم کرنے کی کوشش کی مگر اُسے ایسی چوٹ پڑی تھی کہ وہ دل کی باتیں اور بیوی کے ساتھ اپنے تعلقات بتانے کی بجائے اپنے خاوندپن اور اپنی مردانگی کا دفاع کرنے لگا۔ میں جان گیا کہ مجھے کیس رجسٹر کرنا پڑے گا اور اس گھرانے کے متعلق اپنے مخبروں سے معلومات لینی پڑیں گی۔

میں اُس کے گھر چلا گیا۔ مکان کو اندر باہر سے دیکھنا ضروری تھا۔ مکان کو غور سے دیکھا۔ وہ کمرہ دیکھا جس میں لڑکی رات سوتی تھی۔ ڈیوڑھی

دیکھی۔ اگر لڑکی صحن میں یا چھت پر سوئی ہوئی ہوتی تو اس پر غور کیا جاسکتا تھا کہ رات کو کوئی دیوار پھلانگ کر یا کسی اور طرف سے آیا اور اُس نے کلوروفارم سے آلودہ رومال لڑکی کی ناک پر رکھا اور اُسے بے ہوش کر کے اُٹھا لے گا اور خاوند گہری نیند سویا رہا۔ اس مکان میں ایسا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بتایا گیا کہ لڑکی کمرے میں سوئی تھی اور کمرے کے دروازے کی اندر والی چٹخنی چڑھی ہوئی تھی۔

جیسی ماں ویسی بیٹی

میں نے گمشدہ لڑکی کی ساس کو کمرے میں بٹھا لیا۔ اُس سے بھی وہی کچھ پوچھنا شروع کیا جو میں اُس کے خاوند اور بیٹے سے پوچھ چکا تھا مگر اس عورت کا انداز بالکل مختلف تھا۔ وہ اُنہی عورتوں اور ساسوں میں سے تھی جو ہمارے گھروں، محلوں اور برادریوں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ اصل بات اشاروں میں کرتی اور غلط بات کا بتنگڑ بناتی ہیں۔ اُس نے میرے ساتھ جو باتیں کیں وہ میں آپ کو اُسی کی زبان میں سُناتا ہوں۔

"میرا بیٹا بدھو ہے"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "اللہ میاں کی گائے ہے۔ اسے سو بار کہا تھا کہ اپنی لاڈلی دُلہن پر نظر رکھو۔ کوٹھے پر بیت الخلا میں جاتی ہے یا کپڑے پھیلانے چڑھتی ہے تو گھنٹہ گھنٹہ فصیل کے ساتھ لگی

کھڑی رہتی ہے۔ چاروں طرف موٹے مسٹنڈے تاک جھانک کے لئے کوٹھوں پر کھڑے رہتے ہیں۔ میرے بیٹے کے مغز میں میری بات نہ پڑی۔ میں ان چُھل چھل کرتی چھوکریوں کو خوب جانتی ہوں۔"

"تو تمہارا یہ خیال ہے کہ لڑکی نے کسی کے ساتھ درپردہ دوستی کر لی تھی اور وہ اپنی مرضی سے چلی گئی ہے"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "مجھے اُس آدمی کا نام پتہ بتا دو، پھر دیکھنا لڑکی کا اور اُس آدمی کا میں کیا حال کرتا ہوں۔"

"میری جانے بلا، وہ کلموا کون ہے"۔۔۔ ساس نے بات میں پیچیدگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو تمہیں یقین ہے نا، کہ لڑکی اپنی مرضی سے گئی ہے؟"

"تو اور کوئی اُسے اُٹھا کر لے گیا ہے؟"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "میرے بیٹے پر تو اُس نے حُسن اور ناز نخروں کا جادو چلا رکھا تھا۔"

"تمہارے ساتھ لڑتی جھگڑتی رہتی ہو گی؟"

"میں نے تو اُس کے ساتھ کبھی مُنہ نہیں لگایا تھا"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "ہماری قسمت پھوٹی تو اس کا رشتہ لینے چل پڑے۔ عورتوں نے کہا تھا کہ جیسی ماں ہے ویسی بیٹی نکلے گی، اس رشتے سے باز آجاؤ۔ میں تو باز آجاتی مگر باپ بیٹا ایسے لٹو ہوتے کہ یہی رشتہ کر لیا۔"

"بیٹی کی ماں کیسی ہے؟"

"اصل بدمعاش ہے"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "اُس کا خاوند میرے

بیٹے کی طرح کاٹھ کا اُلّو ہے۔ بیوی مردوں کے کان کاٹتی پھرتی ہے۔"

میں نے بہت کوشش کی کہ اس عورت کے سینے سے کام کی کوئی بات نکالوں مگر وہ پہیلیاں بجھا رہی تھی۔ میں نے زیادہ زور بھی نہ دیا۔ میں ابھی صحیح معنوں میں تفتیش نہیں کر رہا تھا۔ اس سے مجھے یہ پتہ چلا کہ لڑکی کی ماں بدمعاش ہے اور بیٹی بھی ویسی ہی ہے اور وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ لڑکی کا سلوک اُس کے بیٹے کے ساتھ کیسا تھا اور کیا اُن کا لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا؟ اُس نے گول مول سا جواب دیا اور یہ بھی کہا کہ ان کا لڑائی جھگڑا کبھی نہیں ہوا تھا اور یہ بھی کہ لڑکی کو اس گھر میں کوئی ایسی تکلیف نہیں تھی کہ وہ یہاں سے بھاگ جاتی۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لڑکی کی ماں نے لڑکی کو غائب کر دیا ہو"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اور اُس نے تم لوگوں سے کوئی اپنی شرط منوانے کے لئے یا رقم بٹورنے کے لئے تمہیں عدالت میں گھسیٹنے کی دھمکی دی ہو۔"

"وہ خوبصورت عورت ہے"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "اور بدمعاش بھی ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتی ہے۔ آپ اُس کے گھر کی تلاشی لیں، ہو سکتا ہے لڑکی وہیں سے برآمد ہو جائے۔ اگر ایسا ہی ہوا تو میں لڑکی کو طلاق دلوا دوں گی۔ ہماری بہت بے عزتی ہو رہی ہے۔"

وہ طلاق سے ڈرتی تھی

پھر میں یہاں سے اُٹھ کر لاپتہ لڑکی کے میکے گھر چلا گیا جو دوسرے

محلے میں تھا۔ لڑکی کے باپ کو اور اُس کی ماں کو اکٹھا بٹھا لیا۔ دونوں کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے ایسے آنسو لڑکی کی ساس اور سسر کی آنکھوں میں نہیں دیکھے تھے۔ آنسوؤں کی بجائے اُن کے انداز میں غصے کی جھلک تھی۔ میں نے خاص طور پر دیکھا کہ لڑکی کی ماں بڑی خوبصورت عورت ہے۔ اُس کی آنکھوں میں دل موہ لینے والا تاثر تھا اور روتے ہوئے بھی اُس کے ہونٹوں کے کونوں پر تبسم کی ہلکی سی جھلک قائم تھی۔ دوسری چیز یہ نوٹ کی کہ جب میں نے ان دونوں کے ساتھ باتیں شروع کیں تو میں سوال خاوند سے کرتا تو جواب بیوی دیتی تھی۔ خاوند سر ہلا کے رہ جاتا تھا۔

میں یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان کے دل میں اپنی بیٹی کے سسرال کے خلاف کتنی کچھ دشمنی ہے اور کیا یہ دشمنی اس قدر زیادہ ہے کہ انہوں نے لڑکی کو خود ہی غائب کر دیا ہو۔ میں نے ان سے گھما پھرا کر پوچھا۔ ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ لڑکی کے سسرال کو برا بھلا کہا لیکن انہوں نے میرا یہ شک رفع کر دیا کہ لڑکی کو انہوں نے غائب کیا ہے۔

"مجھے تو یہ شک ہے کہ میری بیٹی دریا میں کود گئی ہے"۔۔۔ اُس کی ماں نے کہا۔۔۔ "سسرال والوں نے اُس کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔"

"وہ آپ کے پاس شکایتیں لے کر آتی ہو گی"۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "اُسے کیا شکایت تھی؟"

"اُس کی ساس اپنے بیٹے اور میری بیٹی کو اپنے پاؤں کے نیچے

رکھنا چاہتی تھی"— اُس نے جواب دیا —"اُس کا بیٹا میری بیٹی کو اتنا زیادہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی ماں کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ پہلے ساس میری بیٹی کو پریشان کرتی رہی پھر اُس نے اپنے بیٹے پر اپنا جادو چلا لیا۔ اُس کا بیٹا کوئی چھ ماہ سے میری بیٹی کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگا تھا۔ میری بیٹی مجھے بتاتی تھی کہ اُس نے پہلے تو میری بیٹی سے یہ کہنا شروع کیا کہ ڈیڑھ سال گزر گیا ہے، بچہ پیدا ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس کے ساتھ اُس نے میری بیٹی کے چال چلن پر شبہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ دراصل وہمی آدمی ہے۔ میری بیٹی ہنس مکھ لڑکی ہے، ہنستی کھیلتی ہے۔ وہ خوبصورت بھی ہے۔ اس کا خاوند خود خوبصورت نہیں اس لئے اُسے وہم ہو گیا ہے کہ میری بیٹی اُسے دھوکہ دے رہی ہے۔ اب کوئی ڈیڑھ دو مہینوں سے اس آدمی نے میری بیٹی کو یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ دو چار مہینوں تک بچے کے آثار نظر نہ آئے تو وہ دوسری شادی کر لے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ میری بیٹی اپنے خاوند کو سچے دل سے چاہتی ہے۔"

"اُس نے کبھی تمہیں بتایا ہو گا یا تم نے پوچھا ہو گا کہ اُس کا خاوند بچہ پیدا کرنے کے قابل ہے؟"

"وہ کہتی تھی کہ اُسے اپنے خاوند میں کوئی نقص نظر نہیں آتا"— اُس نے جواب دیا —"وہ بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ طلاق کے لفظ سے ہی وہ ڈرتی تھی۔ اُس کی ساس نے محلے کی دو تین عورتوں سے کہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی دوسری شادی کرائے گی۔"

"اُس کی ساس اور خاوند تمہاری بیٹی کے چال چلن پر شُبہ کرتے تھے؟"— میں نے پوچھا —"کیا انہوں نے کسی آدمی کا بھی نام لیا تھا کبھی؟"

"نہیں"— اُس نے جواب دیا —"میں دو تین بار اپنی بیٹی کی ساس کے ہاں گئی اور اُسے کہا کہ وہ مجھے بتا دے کہ میری بیٹی کس آدمی کے ساتھ خراب ہے تو میں اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے آؤں گی۔ یہ عورت سوائے طعنہ زنی کے مجھے کوئی جواب نہ دے سکی۔ میری بیٹی کے ساتھ مجھے بھی بدچلن بنا دیا۔ اس پر میری بیٹی اُس کے ساتھ لڑ پڑی جھگڑ پڑی۔ اس عورت نے اپنے بیٹے کو اُس کے خلاف کر دیا۔ وہ جس رات گھر سے غائب ہوئی اُس سے چار پانچ روز پہلے میرے پاس آئی تھی۔ اتنی ہنس مکھ لڑکی رو رہی تھی۔ کہنے لگی کہ خاوند نے اُسے کہہ دیا ہے کہ ایک تو تم اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہو، دوسرے تم میری ماں سے لڑتی ہو۔ میں اب دوسری شادی کا بندوبست کر رہا ہوں۔ میں بھی پریشان ہو گئی۔ میرے داماد کی ماں کو سارا محلہ اور ساری برادری جانتی ہے کہ کیسی عورت ہے۔ اصل فسادن ہے....

"میں اپنی بیٹی کو جمال شاہ کے پاس لے گئی اور انہیں بتایا کہ کوئی تعویذ دھاگہ، کوئی ٹونہ ٹوٹکا بتائیں جس سے میری بیٹی کی گود ہری ہو جائے۔ جمال شاہ بہت حیران ہوئے کہ ابھی دو سال گزرے ہیں اور یہ لوگ اولاد کے لئے پریشان ہو گئے ہیں۔ میں نے انہیں

بتایا کہ لڑکی کی ساس فسادن اور بیٹا وہمی ہے۔ جمال شاہ نے لڑکی کی آنکھوں میں پھونکیں ماریں اور اسے اچھی طرح دیکھ کر کہا کہ اس لڑکی کی گود ضرور ہری ہوگی۔ انہوں نے دو تعویذ دیئے اور یہ بھی کہا کہ وہ اگلے روز اُن کے پاس خود ہی آجاتے۔ میں نے بھی بیٹی سے کہا کہ وہ جمال شاہ کے حکم کے مطابق اُن کے پاس آتی رہے۔"

"وہ پھر گئی تھی؟" — میں نے پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں" — اُس نے جواب دیا — "اُسی روز وہ اپنے سسرال چلی گئی تھی۔ اس کے بعد مجھے ملی نہیں۔ پھر اطلاع ملی کہ وہ لاپتہ ہوگئی ہے۔"

بُدھو خاوند کی ہوشیار بیوی

اگر یہ عورت سچ کہہ رہی تھی کہ اُس کی بیٹی کی ساس اور اُس کا خاوند اُسے بدچلن اور اولاد پیدا کرنے کے نااہل کہہ کہہ کر پریشان کرتے رہتے تھے تو یہ دونوں اور لڑکی کا سسر جھوٹے تھے۔ تینوں نے کہا تھا کہ ان میں سے کسی کا بھی لڑکی کے ساتھ کبھی جھگڑا نہیں ہُوا تھا۔ لڑکی کی ماں کا دوسرا انکشاف بھی میرے کام کا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ لڑکی کو جمال شاہ کے پاس اولاد کے لئے لے گئی تھی اور جمال شاہ نے اُسے کہا تھا کہ لڑکی اُس کے پاس آتی رہے۔ میں اس قماش کے

لوگوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ بے شک تعویذ وغیرہ دینا جمال شاہ کا پیشہ نہیں تھا لیکن میرے ذہن میں یہ بات آگئی کہ لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ سوال پیدا ہُوا، کیا لڑکی جمال شاہ کے پاس گئی اور اُس نے اُسے ورغلا لیا؟

میں ایک بار پھر لڑکی کے سسرال گھر چلا گیا۔ ساس، سسر اور خاوند کو میں نے بُرا بھلا کہا کہ انہوں نے میرے آگے جھوٹ بولا ہے۔ انہیں پھر الگ الگ بٹھایا تو لڑکی کی ماں کی کئی ایک باتوں کی تصدیق ہوگئی۔ اُس کے خاوند سے پوچھا کہ وہ اپنی بیوی پر بدچلنی کا الزام کس بنیاد پر لگاتا تھا۔ وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ اولاد کے متعلق اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں اُسے کہتی تھی کہ جمال شاہ نے بتایا ہے کہ اس لڑکی کی گود کبھی ہری نہیں ہوگی۔ خاوند نے یہ بھی تسلیم کیا کہ لڑکی اُسے دل وجان سے چاہتی تھی۔ ان لوگوں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس رات لڑکی غائب ہوتی ہے اُس روز اُس کی اور ساس کی لڑائی ہوتی تھی اور خاوند نے اُسے فیصلہ سُنا دیا تھا کہ وہ دوسری شادی ضرور کرے گا۔ اس سے مجھے شک ہُوا کہ لڑکی نے خودکشی کر لی ہوگی۔ میں نے ان پر بہت زور دیا کہ وہ کسی ایک آدمی کا نام بتا دیں جس پر انہیں شک ہے کہ لڑکی نے اُس کے ساتھ درپردہ دوستی کر لی ہوگی۔ وہ ایک بھی نام نہ بتا سکے۔

میں جب اس گھر سے نکلا تو میرے ذہن میں دو شکوک تھے —

لڑکی جمال شاہ کے پاس گئی اور واپس نہ آئی۔ دوسرا یہ کہ لڑکی نے خودکشی کر لی ہے۔

میں تھانے گیا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ میرے اے۔ ایس۔ آئی نے مخبروں کو کام پر لگا دیا تھا۔ ان میں سے ایک عورت کو بلایا جو زمین کی تہہ کی بھی خبر لے آتی تھی۔ وہ لڑکی کو اور اُس کی ماں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اُس نے بتایا کہ لڑکی کی ماں کے متعلق مشہور ہے کہ اُس کا چال چلن ٹھیک نہیں لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ کوئی آدمی اور کوئی عورت یہ نہیں بتا سکتی کہ اُس کے تعلقات کس کے ساتھ ہیں۔ اس کے خلاف تین ثبوت پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خوبصورت ہے۔ اُس کی عمر اپنے خاوند کی عمر سے ایک دو سال ہی کم ہے لیکن دس بارہ سال کم لگتی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ہنسنے ہنسانے کی عادی ہے۔ اُچھل کود بھی کرتی ہے اور تیسرا ثبوت یہ کہ اُس کا خاوند چُپ چاپ اور بُدھو سا آدمی ہے۔

اس مُخبر عورت کی پوری بات سن کر میں نے یہ رائے قائم کی کہ لڑکی کا باپ اپنی ذمہ داریوں اور روزمرّہ زندگی کے حقائق سے مفرور ہے۔ گھر اور برادری کے مسائل کی طرف کم ہی توجہ دیتا ہے۔ اس قسم کے خاوند اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی بیویاں من مانی کرتی ہیں لیکن اچھے خاندانوں کی بیویاں گھر بار خود سنبھال لیتی ہیں۔ یہ عورت انہی بیویوں میں سے تھی۔ ان کی آمدنی کا ذریعہ زمین

تھی اور کرائے پر چڑھا ہوا ایک مکان اور دو دکانیں۔ یہ سارا انتظام بیوی نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ برادری کے بھی کئی جھنجھٹ اور کئی رسم و رواج اور کئی مسائل ہوتے ہیں۔ یہ بھی اس بیوی نے سنبھال رکھے تھے۔

اگر باپ پر منحصر ہوتا تو وہ اپنی بیٹی کا رشتہ بھی نہ کر سکتا۔ یہ لڑکی کی ماں کا انتظام تھا کہ اُس نے لڑکی کا رشتہ طے کیا اور شادی کے تمام تر انتظامات خود کیے۔ لڑکی کے باپ کا تعاون اتنا سا ہی تھا کہ روپیہ پیسہ بیوی کی تحویل میں رکھتا تھا اور اُس سے اُس نے کبھی باز پُرس نہیں کی تھی کہ وہ کہاں خرچ کرتی ہے اور کتنا کرتی ہے۔ اُس نے خاوندوں والا رُعب داب رکھا ہی نہیں تھا۔ وہ عورت ذات تھی۔ اُسے سو ڈھنگ کھیلنے پڑتے تھے۔ عورت ذات ہونے کی وجہ سے ہی وہ بدنام ہو گئی۔ اُس کی خوبصورتی اور زندہ دلی نے بھی اُسے بدنام کیا۔

میری مُخبر عورت نے مجھے بڑی اچھی رپورٹ دی۔ گمشدہ لڑکی کے متعلق بھی اُس نے اسی قسم کی رپورٹ دی۔ اُس نے بتایا کہ لڑکی ماں کی طرح خوش مزاج ہے اور گھر بار کے انتظامات ماں کی طرح اپنے ہاتھ میں رکھنے کی قائل ہے۔ دل پھینک عاشق اُس کی راہ میں کھڑے رہتے ہیں لیکن لڑکی ایسی ویسی نہیں۔ البتہ لڑکی کی ساس کے متعلق میری مُخبر نے اچھی رائے نہ دی۔

میں نے لڑکی کے لاپتہ ہونے کی رپورٹ درج کر لی۔ ایسی رپورٹ

کے ضمن میں پولیس کو خاصی کاغذی کارروائی کرنی ہوتی ہے۔ وہ میں نے کرلی اور میں سوگیا۔

جمال شاہ کی لاش ملی

صبح میں نے تھانے میں آکر اپنا کام شروع کیا ہی تھا کہ چار آدمی آئے۔ انہوں نے بتایا کہ شہر سے کوئی ایک میل دُور جمال شاہ کی لاش پڑی ہے۔ اُس کا پیٹ پھٹا ہُوا ہے اور ٹانگیں گیدڑوں اور اُودبلاؤ وغیرہ نے کھالی ہیں۔ ان چار آدمیوں میں دو جمال شاہ کے قریبی رشتہ دار تھے اور دو کسی گاؤں کے رہنے والے دیہاتی تھے۔ یہ دونوں اُدھر سے گزُر رہے تھے۔ راستے میں اُنھوں نے لاش دیکھی۔ وہ جمال شاہ کو پہچانتے تھے۔ انہوں نے اُس کے گھر اطلاع دی اور یہ سب رپورٹ دینے آگئے۔

میں نے لڑکی کی گمشدگی کی تفتیش اے۔ایس۔آئی کے سپُرد کرکے اُسے بتایا کہ میں اس وقت تک کیا کرچکا ہوں۔ میں نے لاش دیکھنے والے دیہاتیوں سے ضروری معلومات لیں۔ ان کے خیال کے مطابق جمال شاہ کو درندوں نے نہیں مارا، وہ قتل ہوا ہے۔ ہندوستان کے اُس علاقے میں بھیڑیئے پائے جاتے تھے۔ اگر جمال شاہ ان کا شکار ہوا ہوتا تو لاش کی صرف ہڈیاں رہ جاتیں۔ میں نے کھوجی کو بلوالیا اور

گھوڑے پر سوار ہوکر ضروری سٹاف کے ساتھ جائے واردات پر پہنچا۔

لاش ایسی جگہ پڑی تھی جو عام راستہ نہیں تھا۔ پگڈنڈی دو اڑھائی فرلانگ دور تھی۔ اس سے یہ فائدہ ہُوا کہ کھُرے مل گئے۔ کھوجی نے بڑی محنت اور دانش مندی سے کھُرے تلاش کئے اور میرا کام آسان کردیا۔ میں نے لاش کا نظری معائنہ کیا۔ سر پر چوٹ کا اُبھار تھا۔ یہ لاٹھی یا موٹے ڈنڈے کی ضرب تھی۔ پیٹ اس طرح پھٹا ہُوا تھا کہ انتڑیاں باہر آگئی تھیں۔ پیٹ چاقو سے چاک کیا گیا تھا۔ گیدڑوں وغیرہ نے انتڑیاں اور پیٹ کے کچھ اعضا کھالئے تھے۔ دونوں ٹانگوں کا بہت سا گوشت بھی کھایا جاچکا تھا۔

لاش کے اردگرد کوئی کھُرا سلامت نہیں تھا۔ لاش دیکھنے والوں اور مقتول کے رشتہ داروں نے مجرموں کے کھُرے مٹا دیئے تھے۔ یہی کام رات گیدڑوں وغیرہ نے کیا تھا لیکن کھوجی کو جائے واردات سے ہٹ کر کھُرے مل گئے تھے۔ جمال شاہ کے کھُرے کی تصدیق اُس کی جُوتی سے ہوگئی جو اُس کے پاؤں میں تھی۔ اس کے کھُروں کے ساتھ جتنے کھُرے تھے، وہ مجرموں کے ہی ہوسکتے تھے۔ کھوجی نے مجھے دُور اُس سمت لے جاکر جدھر قصبہ تھا یعنی جدھر جمال شاہ کا گھر تھا، کھُرے دکھائے۔

موسم خشک تھا اس لئے گھاس نہیں تھی اور زمین پکّی نہیں رہی تھی۔ اس پر دھول زیادہ تھی۔ ایسی زمین کھُروں کے لئے موزوں ہوتی ہے۔

ان کھروں سے یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ جمال شاہ کے ساتھ کتنے آدمی تھے۔ ان میں ایک کھرے کے متعلق کھوجی نے بتایا کہ یہ کسی لڑکی کا ہے یا تیرہ چودہ سال کی عمر کے لڑکے کا۔ جوتی شہری طرز کی معلوم ہوتی تھی۔ کھروں کے مطابق یہ لوگ جمال شاہ کے گھر کی طرف سے آتے اور اس جگہ پہنچے جہاں لاش پڑی تھی۔ لاش سے آگے جو کھرے ملے، ان میں جمال شاہ کا کھرا نہیں تھا۔ لڑکی یا لڑکے کا کھرا تھا۔ ہم یہ دیکھتے ہوئے آگے چلتے گئے۔ زمین بڑی واضح شہادت دے رہی تھی۔ کھوجی نے مجھے روک لیا اور ہنس کر بولا ——"غور سے دیکھیں اور بتائیں کہ آپ کو کیا نظر آیا ہے؟"

مجھے اس فن کا اتنا تجربہ نہیں تھا، لیکن کھرے اتنے صاف تھے کہ میں نے کھوجی سے کہا ——"کسی کو گھسیٹا جا رہا ہے یا کوئی اور چیز گھسیٹی جا رہی ہے؟"

کھوجی نے مجھے کھرے دکھا کر کہا ——"یہ لڑکی یا لڑکے کے پاؤں کی لکیریں ہیں۔ اسے گھسیٹ کر لے جا رہے ہیں۔ یہ اس کی ایڑیوں یا پنجوں کے نشان ہیں۔ آپ دوسرے کھرے دیکھیں۔ ان میں آپ کو لڑکی یا لڑکے کے کھرے نہیں ملیں گے۔"

ہم اور آگے گئے تو تھوہر کی خاردار جھاڑیاں آگئیں۔ راستے میں سلیپر نما سینڈل کا ایک پاؤں ملا۔ یہ زنانہ سینڈل تھا جو شہر کی لڑکیاں پہنا کرتی تھیں۔ اس سے یقین ہو گیا کہ جسے گھسیٹا جا رہا ہے یہ لڑکی ہے لڑکا

نہیں۔ میں نے زمین پر کھروں کے علاوہ کچھ اور دیکھنا بھی شروع کر دیا۔ اس کے لئے میں پیچھے چلا گیا اور لاش کے قریب سے از سرِ نو کھرے دیکھنے لگا۔ جہاں سے زمین نے بتانا شروع کیا تھا کہ لڑکی کو گھسیٹا جا رہا ہے، میں نے وہاں بیٹھ کر زمین پر ہاتھ مارے۔ دھول زیادہ تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے آگے بڑھتا گیا۔ کھوجی میرے پاس آگیا۔ وہ پچاس سال کے لگ بھگ عمر کا تجربہ کار کھوجی تھا۔ اس نے پولیس کے انگریز افسروں کے ساتھ بھی کام کیا تھا۔ مجھے زمین پہ ہاتھ مارتے دیکھ کر کہنے لگا ——"آپ جو ڈھونڈ رہے ہیں وہ مجھے مل گیا ہے۔"

اُس نے ہاتھ آگے کیا۔ اُس کی ہتھیلی پہ کانچ کی چوڑیوں کے تین ٹکڑے تھے۔ جہاں عورت کے ساتھ دھینگا مشتی ہوتی ہے وہاں چوڑیاں ضرور ٹوٹتی ہیں۔ کھوجی کے ذہن میں بھی چوڑیاں تھیں۔ تین ٹکڑے اُسے مل گئے اور مزید تلاش کے بعد تین اور ٹکڑے مل گئے۔ ان چھ ٹکڑوں میں دو بڑے سائز کے تھے۔ میں نے سینڈل کا ایک پاؤں اور ٹکڑے سنبھال کر رکھ لئے اور کھرا آگے اُٹھانے لگے۔ کچھ اور آگے سینڈل کا دوسرا پاؤں بھی مل گیا اور اس سے آگے ایک اور چیز مل گئی جسے دیکھ کر میں نے رائے قائم کی کہ لڑکی کو ساتھ لے جانے والے اناڑی ہیں۔

یہ لڑکی کا دوپٹہ تھا جو کیکر کی نسل کے ایک چھوٹے سے درخت کی خاردار شاخ میں اُلجھا ہوا تھا۔ کھوجی نے اس کے نیچے زمین دیکھی اور مجھے بتایا کہ یہاں لڑکی رُک گئی ہے اور اسے لے جانے والے اسے

زبردستی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کھُرے گڈمڈ تھے اور کھوجی کی رائے کی تصدیق کرتے تھے۔ شاخ اتنی نیچے نہیں تھی کہ ان لوگوں کے لئے رکاوٹ بنتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی نے لڑکی کو اُٹھا کر اپنے یا کسی ساتھی کے کندھے پر ڈالا تو لڑکی کا سر خاردار ٹہنی تک چلا گیا اور کانٹوں نے اُس کا دوپٹہ اُتار لیا۔ رات کی وجہ سے کوئی دیکھ نہ سکا۔

میں نے دوپٹہ کانٹوں سے الگ کر لیا۔ مجھے اصل رنگ یاد نہیں رہا۔ یہ آسمانی یا انگوری تھا۔ اس سے آگے گئے تو لڑکی کے کھُرے غائب تھے کیونکہ اُسے اُٹھا لیا گیا تھا۔ آگے ندی آگئی۔ میں نے کھوجی کو ایک کانسٹیبل دے کر کہا کہ وہ کھُرا اُٹھاتا جائے۔ میں خود واپس آگیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے چارپائی منگوائی اور لاش اس پر ڈال دی تھی۔ اسے دس میل دُور ایک سول ہسپتال میں پوسٹ مارٹم کے لئے جانا تھا۔

دوپٹہ، سینڈل اور چوڑیوں کے ٹکڑے مل جانے سے مجھے نہ قاتل مل گیا تھا، نہ لڑکی۔ ان چیزوں سے مجھے صرف مدد مل سکتی تھی کہ لڑکی کی کی نشاندہی ہو جاتی۔ مجرم تو ایک آدمی کو قتل کر کے ایک لڑکی کو اپنے ساتھ نہ جانے کہاں لے گئے تھے۔ میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی اور جمال شاہ کے گھر کو چل پڑا۔ میرے ذہن سے لاپتہ لڑکی اُتر چکی تھی۔ اس کی جگہ یہ لڑکی آگئی جس کے سینڈل وغیرہ ملے تھے۔ اب مجھے یہ لڑکی مطلوب تھی۔ ○

مقتول کا بیٹا غمگین نہیں تھا

جمال شاہ کے گھر میں اُن لوگوں کا ہجوم تھا جنہیں اُس کے قتل کی اطلاع مل چکی تھی۔ میں نے اس کے کنبے کے افراد کے متعلق پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ اس کی دو بیویاں ہیں اور پہلی بیوی میں سے ایک جوان بیٹا ہے جو گذشتہ سال شادی کر کے ماں باپ سے الگ ہو گیا ہے اور شہر میں رہتا ہے۔ مجھے تفتیش کا آغاز کرنے کے لئے ان تینوں سے ملنا اور ان کی باتوں سے جمال شاہ کے قتل کا پس منظر معلوم کرنا تھا۔ قتل کا باعث معلوم ہو جانے سے قاتل کی تلاش آسان ہو جاتی ہے۔ جمال شاہ کو قتل کرنے والے رہزن نہیں تھے کیونکہ وہ کچھ دُور تک اُن کے ساتھ گیا تھا۔

جمال شاہ کا بیٹا بھی آگیا تھا۔ اچھا جوان تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اتنا غمگین نظر نہیں آرہا تھا جتنا کوئی بیٹا باپ کی موت پر ہُوا کرتا ہے۔ اگر باپ قتل ہو جائے تو جوان بیٹے دشمنوں کو للکارتے اور انتقام کے نعرے لگاتے پھرتے ہیں۔ اس جوان کو میں دیکھ رہا تھا کہ سرد سا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُس کے ساتھ تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے حویلی کے ایک کمرے میں لے گیا۔ یہ حویلی قلعے کی مانند تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ اس کے بہت سے کمرے ہیں۔ اس اتنی بڑی

حویلی میں صرف جمال شاہ اپنی دو بیویوں کے ساتھ رہتا تھا۔
میں نے اُس کے بیٹے کے ساتھ افسوس اور ہمدردی کے اظہار کے بعد پوچھا کہ قاتل کون ہو سکتا ہے۔ چونکہ جمال شاہ کا زمیندارہ تھا اور کھیتوں کو نہر کا پانی لگتا تھا اس لیئے مجھے یہی نظر آرہا تھا کہ اس سلسلے میں اس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہو گی۔ اُس کے بیٹے کے جواب سے پتہ چلا کہ کھیتی باڑی اور آبپاشی کے سلسلے میں ان کی کسی کے بھی ساتھ دشمنی نہیں تھی۔ میں نے بہت کریدا لیکن بیٹا قتل کا کوئی باعث نہ بتا سکا، نہ اُس نے کسی شک کا اظہار کیا، بلکہ مجھے صاف نظر آیا کہ بیٹا کوئی دلچسپی لے ہی نہیں رہا تھا۔ میں جُوں جُوں اُس سے سوال پوچھتا جا رہا تھا، وہ بے رُخی اور لاتعلقی کا مظاہرہ کرتا جا رہا تھا۔

"میں تم سے کچھ باتیں معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں" —— میں نے جھنجھلا کر کہا —— "مجھے تمہارے باپ کے قتل کی تفتیش کرنی ہے مگر تم مجھے یوں ٹال رہے ہو جیسے میں تمہارے باپ کا مزارعہ ہُوں"

"آپ کسی اور سے پوچھ لیں" —— اُس نے ہارے ہُوئے سے لہجے میں کہا —— "ایک سال گزر گیا ہے، باپ کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ میری ماں اس حویلی میں رہتی ہے۔ میری دلچسپی صرف اس کے ساتھ ہے"

"تمہارے اس سوال کے جواب سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تمہارے دل میں باپ کے خلاف ناراضگی ہے" —— میں نے کہا —— "کچھ پوچھنے سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میں تھانیدار ہوں اور قتل کی تفتیش کر رہا

ہُوں۔ مجھے ٹالنے کی کوشش کرو گے تو میں تمہیں مشتبہ قرار دے کر تھانے لے چلوں گا.... مجھے یہ بتاؤ کہ باپ کے ساتھ تم کیوں ناراض ہو؟"

"آپ کو معلوم ہو گا کہ میرے باپ کی زمین کتنی ہے" —— اُس نے کہا —— "سبزیوں کے باغ کی بھی آمدنی ہے، پھر بھی اُس نے تعویذوں کا اور عمل کا چکر چلا رکھا تھا۔ اس کے پاس زیادہ تر عورتیں آتی تھیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ حاجت مند عورت سے جو قیمت مانگو وہ جھانسے میں آکر دے دیتی ہے۔ ہم سیّد نہیں لیکن میرا باپ جمال شاہ کہلاتا تھا۔ رات کو بھی اس کے پاس ایک دو عورتیں آتی تھیں۔ مجھے یہ سلسلہ پسند نہیں تھا۔ میں نے باپ کو اس دھندے سے روکا مگر وہ مجھے کافر اور مرتد کہتا تھا کیونکہ جس کام کو وہ برحق سمجھتا تھا وہ میری نگاہ میں فریب کاری تھی۔ اگر میرا باپ کسی پیر و مرشد کی نسل سے ہوتا اور اس کے نیچے باپ دادا کی گدی ہوتی، ان بزرگوں کی کوئی کرامت ہوتی تو میں بھی اسے پیر اور مُرشد کہتا۔ میری اُس کے ساتھ اسی بات پہ ناراضگی رہتی تھی"

"اُس کے خاص قسم کے مرید اور مصاحب بھی ہوں گے" —— میں نے کہا —— "ایسے لوگوں کا کاروبار مصاحبوں کے بغیر نہیں چلا کرتا"

"دو آدمی ہیں" —— اُس نے کہا —— "وہ یہیں ہیں۔ اس حویلی میں میرے باپ کا ایک خاص کمرہ ہے۔ گھر میں کسی کو معلوم نہیں وہاں،

کیا ہو رہا ہے۔ میں آپ کو یہ دونوں آدمی دکھا دوں گا۔"

مقتول کی پہلی بیوی کا بلاوا آیا

میں اس سے ابھی بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل نے آ کر مجھے باہر چلنے کو کہا۔ میں باہر گیا تو اُس نے کہا کہ جمال شاہ کی بڑی بیوی نے پیغام بھیجا ہے کہ میں اُسے ملوں۔ میں نے جمال شاہ کے بیٹے سے کہا کہ وہ ہیڈ کانسٹیبل کو وہ دو آدمی ذرا دُور سے دکھا دے جو اُس کے باپ کے خاص آدمی تھے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ ان دو آدمیوں پر نظر رکھے۔ اگر وہ جا رہے ہوں تو انہیں روک لے۔ مجھے معلوم تھا کہ جمال شاہ جیسے آدمیوں کے مصاحب مجرمانہ ذہنیت کے لوگ ہوتے ہیں۔

مجھے حویلی کے ایک اور کمرے میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں تقریباً پنتالیس سال کی عمر کی ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور بولی — "مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ میرے بیٹے کو الگ لے گئے ہیں۔ اس سے مجھے فکر ہوا کہ آپ کسی غلط فہمی میں پڑ کر اسے تھانے لے جائیں گے۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ وہ اکھڑ طبیعت کا لڑکا ہے۔ آپ کو کچھ بتائے گا اور کچھ نہیں بتائے گا۔ میں نے اپنے بیٹے کی بہتری کے لئے آپ کو تکلیف دی ہے۔ آپ مجھ سے پوچھیں، کیا پوچھنا ہے۔"

"میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے خاوند کا قاتل کون ہو سکتا ہے۔"

"یہ بتانا بہت مشکل ہے" — اس نے جواب دیا۔

"مجھے صاف بتا دیں کہ اس حویلی میں عورتوں کا کاروبار ہوتا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو یہ بتا دیتی ہوں کہ اس حویلی میں کیا ہو رہا ہے اور گزشتہ رات کیا ہوا تھا" — اس نے کہا — "اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ آپ کو سوال نہیں کرنے پڑیں گے۔"

یہ عورت خاصی دانشمند لگتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے سینے میں کوئی غبار ہے جو وہ نکالنا چاہتی ہے اور دوسرے یہ کہ اسے اپنے بیٹے کا غم ہے کہ پولیس اُسے شک میں پکڑ لے گی۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور اُسے کہا کہ اُس کے دل میں جو کچھ ہے، میرے آگے نکال دے۔

"اس گھر میں ایک بیوی اور بھی ہے" — اُس نے کہا — "سچی بات یہ ہے کہ میں چاہتی تھی کہ اُس کے ساتھ بات کرنے سے پہلے آپ میرے ساتھ بات کر لیں۔ میرے خاوند کی اس بیوی کی عمر بائیس تیئیس سال ہے اور میرے خاوند کی عمر پچاس سال سے اُوپر ہو گی کم نہیں ہو گی۔ لڑکی نے جب یہاں دیکھا کہ ہمارے خاوند نے کوئی اور ہی دنیا آباد کر رکھی ہے تو لڑکی نے اپنی دُنیا آباد کرنے کی ترکیب سوچ لی۔

یہ ایک ہی سال پہلے کی بات ہے۔ ابھی میرے بیٹے کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ لڑکی کو آپ دیکھنا، بڑی خوبصورت ہے۔ اس لیے میرے بیٹے کو اپنا دل بہلانے کا ذریعہ بنانا چاہا۔ میرا بیٹا اپنے باپ کی حرکتوں سے پہلے ہی پریشان تھا۔ وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ نئی بیوی اس کے ساتھ کس بے حیائی سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی ہے....

"میں نے اپنی اس سوکن سے کہا کہ وہ میرے بیٹے کو خراب نہ کرے۔ اس لڑکی نے کہا کہ میرے بیٹے کو غلط فہمی ہوتی ہے۔ اس کے بعد بھی وہ باز نہ آئی۔ جب میرا بیٹا اس کے ہاتھ نہ آیا تو ایک روز میرے بیٹے نے مجھے بتایا کہ اُسے میری سوکن نے دھمکی دی ہے کہ وہ اُس کے باپ سے کہے گی کہ میرے بیٹے کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ اُس نے اس پر دست درازی کی ہے۔ لڑکی چالاک اور بے حیا تھی۔ میں پرانے زمانے کی سیدھی سادی عورت اپنے خاوند کو اُس کی نئی بیوی کے کرتوت اس لئے بتانے سے ڈرتی تھی کہ وہ نہیں مانے گا۔ کہے گا کہ میں اس کی نئی بیوی کو دیکھ کر خوش نہیں ہوں۔ میں نے اپنے خاوند سے کہا کہ اب لڑکے کی شادی ہو جانی چاہیئے۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ گھر میں ایک جوان لڑکی آ گئی ہے جو میرے بیٹے کی سگی ماں نہیں....

"میرا خاوند اشارہ سمجھ گیا۔ باپ بیٹا ویسے بھی آپس میں کھچے کھچے رہتے تھے۔ ایک رشتہ میرے سامنے تھا۔ میں نے بات پکی کر لی اور

شادی ہو گئی۔ میری سوکن نے باپ بیٹے کے درمیان پکی دشمنی پیدا کر دی۔ میرے کہنے پر باپ نے بیٹے کو الگ کر دیا۔ اُس روز سے وہ الگ شہر میں رہتا ہے۔ میں نے اپنے خاوند سے کہا کہ اُسے اب میری کوئی ضرورت نہیں اس لئے مجھے بھی اجازت دے دے کہ میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہوں۔ میرا خاوند نہ مانا۔ کہنے لگا کہ اس میں اُس کی بے عزتی ہے۔ میں اب اس حویلی میں صرف زندہ ہوں۔ کبھی کبھی بیٹے کے پاس چلی جاتی ہوں۔ وہ نہیں آتا۔ آج باپ کے قتل کی اطلاع پر آیا ہے۔"

ایک لڑکی کمرے میں بند تھی

"یہ تو تم نے اپنی کہانی سنائی ہے"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "اور یہ تم نے شاید اپنے بیٹے کو قتل کے الزام سے بچانے کے لئے سنائی ہے"

"اپنے باپ کو قتل کرنے کی اُسے کوئی ضرورت نہیں تھی"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "زمین جائیداد کا کوئی جھگڑا نہیں۔ باپ نے اُسے حصہ دے دیا ہے۔ وہ تو اپنے باپ کو دل سے اُتار چکا ہے۔ میں آپ کو ابھی کچھ اور سناؤں گی۔ یہ حویلی میرے لئے اور میرے بیٹے کے لئے جہنم بنی رہی ہے۔ مجھے اب یہاں سے ہمیشہ کے لئے نکل جانا ہے۔ میں آپ کو اندر کے بھید بتا دیتی ہوں۔ آپ نے ٹھیک کہا ہے کہ میں اپنے بیٹے کو بچانا چاہتی ہوں.... چار پانچ دن گزرے، ایک رات میرے خاوند

اور اس کی دوسری بیوی کی لڑائی ہو گئی۔ وہ دوسرے کمرے میں تھے۔ دوسری بیوی غصے میں کہہ رہی تھی کہ اس لڑکی کو آپ نے اپنی بیوی بنانے کے لئے کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ میرا خاوند کہہ رہا تھا کہ میں اس سے ایک وظیفہ کرا رہا ہوں۔ میں کوئی بدی نہیں کر سکتا۔ دوسری بیوی اور زیادہ غصے میں آ گئی....

"میرے خاوند نے اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ میں دوڑی گئی اور اسے چھڑایا۔ خاوند کو دھکیل کر باہر کیا۔ دوسری بیوی نے مجھے بتایا کہ اس نے تین دنوں سے اپنے کمرے میں ایک بڑی خوبصورت لڑکی رکھی ہوئی ہے۔ عورتیں تو اس کے پاس آتی ہی رہتی ہیں لیکن وہ تھوڑی دیر بعد چلی جاتی ہیں۔ اس لڑکی کو اس نے تین چار دنوں سے رکھا ہوا ہے۔ یہ اب ہم دونوں پر تیسری سوکن لاتے گا....

"مجھے اس لڑائی سے یہ خوشی ہوئی کہ میرے خاوند کو لگام ڈالنے کے لئے یا باز پرس کرنے کے لئے میری سوکن آ گئی ہے۔ مجھے اب کوئی غم نہیں تھا کہ وہ تیسری شادی کرتا ہے یا کتنی اور کرتا ہے .... میں اپنی سوکن کو اپنے کمرے میں لے آئی۔ میری اس لڑکی کے ساتھ کوئی لڑائی نہیں تھی۔ وہ اب خاوند کے خلاف بہت بھڑکی ہوئی تھی۔ ہم نے اُس رات آپس میں بہت باتیں کیں۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں اپنے خاوند کے خاص کمرے میں کسی طرح جھانکوں اور دیکھوں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس کمرے میں ہم میں سے کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی....

"اس لڑکی نے مجھے ایسا اکسایا کہ میں چلی گئی۔ حویلی کے اندر مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں ڈیوڑھی میں گئی۔ وہاں اندھیرا تھا۔ ڈیوڑھی میں ہی اس کمرے کا دروازہ کھلتا ہے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ درزوں میں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں نے ایک درز میں سے دیکھا لیکن یہ اتنی تنگ تھی کہ اندر کچھ نظر نہ آیا۔ مجھے ایک لڑکی کی اور اپنے خاوند کی باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔ ایک بار میرے خاوند نے بلند آواز سے کہا — 'تمہیں مجھ پر یقین کیوں نہیں آتا۔ میں تمہارے ماں باپ کو اور تمہارے سسرال میں بھی بتا آیا ہوں کہ تم ایک وظیفے کے لئے میرے گھر میں ہو اور میری بیویوں کے پاس ہو۔ اس وظیفے کے بغیر تمہیں اولاد نہیں مل سکتی۔ ہو سکتا ہے میں آج ہی تمہیں گھر لے چلوں' — لڑکی دھیمی آواز میں بول رہی تھی جو میں نہ سمجھ سکی کہ کیا کہہ رہی ہے....

"ڈیوڑھی کے دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ میں دبے پاؤں دوڑ کر اندر آ گئی۔ میرے خاوند نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا۔ میں نے قدموں کی آہٹ سے محسوس کیا کہ کوئی آدمی میرے خاوند کے ساتھ اندر آیا اور لڑکی والے کمرے میں چلا گیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ باہر نکل گئے تو میں ڈیوڑھی میں گئی۔ ڈیوڑھی کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ باہر چاندنی تھی۔ مجھے

اپنا خاوند، ایک لڑکی اور ایک آدمی کھڑے نظر آئے۔ لڑکی شاید اُن کے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہو رہی تھی۔ پھر تینوں چلے گئے۔"

منزل موت تھی

"اس آدمی کو تم نے نہیں پہچانا تھا جو تمہارے خاوند اور لڑکی کو ساتھ لے گیا تھا؟"

"اسے تو میں اندھیرے میں بھی پہچان سکتی ہوں" — اُس نے جواب دیا — "وہ ظفر علی تھا۔ اسے سب ظفرا کہتے ہیں۔ یہ آدمی میرے خاوند کا خاص آدمی ہے اور یہ میری سوکن کا بھی خاص آدمی ہے۔ میرے خاوند کو اس پر پُورا اعتماد ہے لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ ظفرا اُس کی دوسری بیوی کا منظورِ نظر تھا۔ ظفرا بڑا خوبصورت اور دلیر جوان ہے۔ آپ اسے پکڑیں اور پوچھیں۔ میرا خاوند اور لڑکی اسی کے ساتھ گئے تھے۔ صبح اطلاع ملی کہ میرا خاوند قتل ہو گیا ہے۔"

میں دوسری بیوی کے پاس چلا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی تھی۔ خوبصورت اور جوان لڑکی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا نشان تک نہ تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ اس طرح بات کی جیسے میں انجان ہوں مگر اُس نے یہ کہہ کر میرا انداز بدل دیا — "آپ کو اُس نے سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اُس نے میرے متعلق آپ

کو کیا بتایا ہو گا۔ میں اُس کی سوکن ہوں۔ اُس نے میرے متعلق کوئی اچھی بات نہیں کہی ہو گی" — اُس نے مجھے جمال شاہ کی پہلی بیوی کے پاس بیٹھے دیکھ لیا ہو گا۔

"تم سُن کر حیران ہو گی کہ اُس نے تمہارے خلاف کوئی بات نہیں کی" — میں نے کہا — "بلکہ وہ تمہیں اپنی طرح مظلوم اور مجبور کہتی ہے۔ اُس نے میرے دل میں تمہاری ہمدردی پیدا کر دی ہے۔"

میرے ان الفاظ نے اُس کے اور میرے درمیان بیگانگی کی دیوار گرا دی اور وہ میرے ساتھ کھُلنے کی حرکتیں کرنے لگی۔ اُسے ایسی ضرورت نہیں تھی کہ مجھے خوش کرنے کی کوشش کرتی۔ میں نے ذہن پہ زور دیا تو خیال آیا کہ مقتول کا خاص آدمی ظفرا اس لڑکی کا منظورِ نظر ہے اور ظفرا رات کو جمال شاہ اور لڑکی کے ساتھ جاتا دیکھا گیا تھا۔ یہاں سے میرے ذہن میں آئی کہ جمال شاہ کو ظفرے نے ہی قتل کیا ہو گا اور قتل جمال شاہ کی اس چھوٹی بیوی نے کرایا ہو گا۔ اُس نے ظفرے سے کہا ہو گا کہ جو لڑکی جمال شاہ نے کمرے میں رکھی ہوئی ہے، اسے بھی غائب کر دو۔ اگر ایسا ہی ہوا ہے تو چھوٹی بیوی نے جمال شاہ سے جائداد اپنے نام لکھوالی ہو گی۔

میں نے اس لڑکی کو دل میں مشتبہ قرار دے کر اس سے ہمدردی بلکہ دوستانہ لہجے میں باتیں پوچھنی شروع کر دیں۔ میں نے ظفرے کا نام نہ لیا اور میں نے جمال شاہ کے بیٹے کا ذکر نہ کیا۔ اس سے کچھ

باتوں کی تصدیق ہوگئی لیکن میرے لئے یہ کافی نہیں تھا۔ مجھے ظفرے کو اپنے جال میں لینا تھا۔ جمال شاہ کے بیٹے نے ایک اور آدمی کا بھی نام بتایا تھا۔ اُس کا نام اگر مجھے صحیح یاد رہ گیا ہے تو کریم الدین تھا۔ میں نے حویلی پہ دو کانسٹیبلوں کا پہرہ بٹھا دیا اور ظفرے اور کریم کو تھانے بھیج دیا۔ حویلی میں ایک ادھیڑ عمر عورت بھی کام کرتی تھی۔ اس کا خاوند بھی وہاں اُوپر کا کام کرتا تھا۔ تین اور آدمی تھے۔ ان پانچوں کو اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔ اس سے پہلے میں جمال شاہ کے اُس خاص کمرے میں چلا گیا جہاں اُس نے ایک لڑکی رکھی ہوئی تھی۔ وہاں دو پلنگ تھے۔ تلاشی لی تو ایک پلنگ کے تکیے کے نیچے سے ایک پھولدار رومال پڑا ملا۔ اس کے ایک کونے میں کچھ پیسے بندھے ہوئے تھے۔ یہ رومال اور پیسے جمال شاہ کے نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ لڑکی کے ہی ہو سکتے تھے جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔

ان سب کے بیان الگ الگ سنانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ظفرے اور کریم کو الگ رکھا۔ یہ خاص آدمی تھے۔ دوسروں نے تصدیق کی کہ ظفرا اور کریم مقتول کے خاص آدمی تھے اور اندر کی باتیں ان کے سوا اور کوئی نہیں بتا سکتا۔ عورت نے بتایا کہ جمال شاہ کبھی باہر چلا جاتا تھا۔ اس دوران ظفرا جمال شاہ کی دوسری یعنی چھوٹی بیوی کے پاس رہتا تھا۔ ان دونوں کے گہرے مراسم تھے جن سے جمال شاہ بے خبر تھا۔ اس عورت نے یہ بھی بتایا کہ جمال شاہ نے کمرے میں

تین چار دنوں سے ایک لڑکی کو رکھا ہوا تھا۔ اس عورت نے اس لڑکی کو صرف ایک بار اتنا سا ہی دیکھا تھا کہ لڑکی کا دوپٹہ اُس کے ماتھے سے نیچے آیا ہوا تھا اس لئے وہ لڑکی کو پہچان نہ سکی۔ اسے جمال شاہ نے کمرے میں زیادہ دیر ٹھہرنے نہیں دیا تھا۔ میں نے اس عورت کو دوپٹہ دکھایا جو درخت کی شاخ سے ملا تھا۔ اُس نے پورے یقین سے کہا کہ لڑکی کے دوپٹے کا یہی رنگ ہے۔

دوپٹہ، سینڈل اور چوڑیاں

میں ان لوگوں سے تقریباً فارغ ہو چکا تھا کہ مجھے گمشدہ لڑکی کا سُسر اور اُس کا خاوند تھانے میں آتے دکھائی دیئے۔ میں نے اس لڑکی کی تفتیش اپنے اے۔ ایس۔ آئی کے حوالے کر دی تھی۔ اُسی نے ان دونوں کو بلایا تھا۔ انہیں دیکھ کر مجھے یاد آگیا کہ اس لڑکی کی ماں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اُسے جمال شاہ کے پاس لے گئی تھی اور جمال شاہ نے لڑکی سے کہا تھا کہ وہ اس کے پاس اکیلی آتی رہے۔ اس کے بعد لڑکی اپنے سُسرال چلی گئی تھی، اس لئے ماں کو معلوم نہیں تھا کہ لڑکی جمال شاہ کے پاس گئی تھی یا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں آئی کہ جمال شاہ کی بیویوں نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے تین چار دنوں سے اپنے کمرے میں ایک لڑکی رکھی ہوئی ہے۔

مجھے یہ بھی یاد کہ لڑکی لاپتہ ہوگئی تو لڑکی کی ماں اور ساس جمال شاہ کے پاس گئی تھیں۔ ان کے بیان کے مطابق جمال شاہ نے انہیں کہا تھا کہ لڑکی اپنی مرضی سے گئی ہے اور اب واپس نہیں آئے گی۔ اگر وہ زندہ آگئی تو اس کے خاوند کو جانی اور مالی نقصان ہوگا۔ دراصل جمال شاہ لڑکی کو واپس نہیں کرنا چاہتا۔

میں اُچھل کر اُٹھا اور لڑکی کے سسر اور خاوند کو اپنے دفتر میں لے آیا۔ انہیں دوپٹہ، سینڈل، چوڑیوں کے ٹکڑے اور رومال دکھایا جس میں پیسے بندھے ہوئے تھے۔ خاوند نے دوپٹہ، سینڈل اور چوڑیوں کے ٹکڑے پہچان لئے۔ رومال کو غور سے دیکھ کر اُس نے کہا کہ اس کے پاس ایسا رومال شاید تھا۔ یہ چیزیں دیکھ کر اُس کا رنگ اُڑ گیا۔ اُس کا باپ پریشان ہوگیا۔ خاوند نے کانپتی ہوئی زبان سے پوچھا — "یہ چیزیں کہاں سے ملی ہیں؟"

"یہ چیزیں اُس جگہ سے ملی ہیں جہاں تم جیسے خاوندوں کی بیویاں اولاد لینے جایا کرتی ہیں" — میں نے غصّے سے کہا — "شادی ہوتے ابھی دو سال ہوتے تھے اور تم اُس سے اولاد مانگنے لگے اور اُسے طلاق کی دھمکی دی۔ وہ تمہارے لئے اولاد لینے گئی تھی۔"

میں نے اے ایس آئی کو بلا کر کہا کہ لاپتہ لڑکی کی ماں اور اُس کی ساس کو بھی بلا کر یہ چیزیں شناخت کرالو۔ اب قتل اور لڑکی کی گمشدگی کی تفتیش ایک ساتھ ہوگی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ لاپتہ لڑکی

جمال شاہ کے پاس تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ لڑکی کو کون لے گیا۔ مجھے یہ نظر آنے لگا کہ جمال شاہ اس لڑکی کی خاطر قتل ہوا ہے۔ مجرم بردہ فروش بھی ہوسکتے تھے اور یہ جمال شاہ کی دوسری بیوی بھی ہوسکتی تھی جس نے جمال شاہ کو قتل کرا دیا اور قاتل لڑکی کو لے گئے یا اُسے کہیں خراب کرکے قتل کر دیا۔

میں نے ظفرے کو بلا لیا اور اُسے کہا — "دیکھو ظفرے! ایک آدمی قتل ہوگیا ہے اور ایک لڑکی لاپتہ ہے۔ اگر تمہیں یہ امید ہے کہ مجھے اُلّو بنا لو گے اور میں تمہیں بے گناہ سمجھ کر شام سے پہلے پہلے چھوڑ دوں گا تو یہ امید دل سے نکال دو۔ میرے ساتھ دوستوں کی طرح بات کرو اور مجھ سے دوستی کا حق لو۔"

"جنابِ والا!" — اُس نے کہا — "میں جمال شاہ کا نوکر تھا۔ اُن کا دیا کھاتا تھا۔ میں نے بھلا انہیں کیوں قتل کیا ہوگا؟ میں تو اُن کی جوتیوں کا غلام تھا۔"

"اور تم اُس کی چھوٹی بیوی کے بھی غلام تھے" — میں نے کہا — "مجھے صرف اس سوال کا جواب دے دو کہ کل رات تم جمال شاہ کے گھر گئے تھے۔ جمال شاہ اور لڑکی تمہارے ساتھ چلے گئے تھے۔ انہیں تم کہاں لے گئے تھے؟"

وہ میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"کہہ دو کہ تم رات جمال شاہ کے گھر نہیں گئے تھے" — میں نے کہا

—"پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم کہاں گئے تھے۔"

لڑکی کا سودا ہو گیا

اُس کا منہ خوف اور حیرت سے کھل گیا۔ وہ مجرمانہ ذہنیت کا آدمی تھا، باقاعدہ جرائم پیشہ نہیں تھا۔ پولیس کے ساتھ اُس کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اُس کی زبان کھلوانے کے لئے مجھے زیادہ کاوش نہ کرنی پڑی۔ اُس نے بتا دیا کہ یہ وہی لڑکی تھی جس کی گمشدگی کی ہمیں رپورٹ ملی تھی۔ اُس نے جو کہانی سنائی وہ یوں تھی:

یہ لڑکی اپنی ماں کے ساتھ جمال شاہ کے پاس اولاد کے لئے تعویذ یا کوئی ٹونہ ٹوٹکا پوچھنے آئی۔ ماں بیٹی بہت خوبصورت تھیں۔ جمال شاہ کے کردار کے متعلق اُس نے بتایا کہ وہ سنجیدگی سے دعویٰ کیا کرتا تھا کہ اُس کے پاس ایک علم ہے جس سے وہ لوگوں کی مُرادیں پوری کر سکتا ہے، بے اولاد عورتوں کو اولاد دے سکتا ہے اور غیب کا حال بھی بتا سکتا ہے۔ وہ کبھی کبھی اپنے علم کو عیاشی کا ذریعہ بھی بنا لیتا تھا۔ اس لڑکی کو اُس نے کہا کہ وہ اُس کے پاس اکیلی آئے، وہ اُسے ایک وظیفہ بتائے گا۔ لڑکی ایک روز اکیلی آئی۔ جمال شاہ کے پاس تین آدمی آتے بیٹھے تھے۔ یہ تینوں وہاں سے پندرہ سولہ میل دُور کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔

وہ کبھی کبھی جمال شاہ کے پاس آیا کرتے تھے۔ ظفرے کی بھی ان لوگوں کے ساتھ راہ و رسم تھی۔ یہ تینوں رسہ گیری کرتے تھے اور کوئی موٹی آسامی مل جاتے تو رہزنی کی واردات بھی کر گزرتے تھے۔ جس روز یہ لڑکی جمال شاہ کے پاس اکیلی آئی، یہ تینوں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے لڑکی کو دیکھ لیا۔ ان میں سے ایک نے جمال شاہ سے پوچھا کہ لڑکی کون ہے؟ جمال شاہ نے بتایا کہ وہ کون ہے اور کیوں آئی ہے۔ اس آدمی نے جمال شاہ سے کہا کہ وہ اس لڑکی کو لے جانا چاہتا ہے۔ جمال شاہ نے کہا کہ وہ خود کوئی نیک اور پارسا تو نہیں لیکن وہ کسی ایسی لڑکی کو اغوا نہیں ہونے دے گا جو اُس کے بھروسے پہ یہاں اپنی کوئی مُراد لے کر آئی ہے۔

یہ تینوں آدمی اُس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ ان کی جمال شاہ کے ساتھ دوستی تھی۔ وہ دوستانہ دعوے جتا رہے تھے۔ لڑکی کو جمال شاہ نے الگ کمرے میں بٹھا دیا تھا۔ ظفرا بھی اس محفل میں موجود تھا۔ انہوں نے ظفرے کو اپنا حامی بنا لیا۔ ظفرے کا جمال شاہ پہ اثر تھا۔ اُس نے جمال شاہ کو راضی کر لیا اور تینوں آدمیوں سے کہا کہ لڑکی اُن کے حوالے کر دی جائے گی، وہ قیمت کیا دیں گے۔ انہوں نے ایک ہزار روپیہ قیمت بتائی۔ جمال شاہ نے سات ہزار کہی اور کہا — "لڑکی تم نے دیکھ لی ہے۔ بازار سے اُٹھ کر نہیں آئی۔ شریف گھرانے کی لڑکی ہے۔ اس کے حُسن اور جسم کی قیمت سات ہزار بھی کم ہے۔"

"ہم اسے اپنے پاس تو نہیں رکھیں گے"۔۔۔ ایک آدمی نے کہا ۔۔۔ "کسی نواب کے ہاتھ بیچنے کے لئے لے جا رہے ہیں"۔

"میں جانتا ہوں تم دس ہزار سے کم پر نہیں بیچو گے"۔۔۔ ظفرے نے کہا۔

وہ نوابوں اور مہاراجوں کا زمانہ تھا۔ یہ انگریزوں کے پروردہ تھے۔ اُن کی رعایا فاقہ کشی کرتی تھی اور نواب اور مہاراجے عیش و عشرت کرتے تھے۔ اُن کے محل خوبصورت لڑکیوں سے بھرے رہتے تھے۔ بردہ فروش خوبصورت لڑکیاں اُن کے ایجنٹوں کے ہاتھ بیچا کرتے تھے۔ ظفرے کے بیان کے مطابق اِن تینوں نے یہ کاروبار کبھی نہیں کیا تھا، اس کاروبار سے واقف ضرور تھے۔ یہ لڑکی انہیں اتنی پسند آگئی تھی کہ انہوں نے اسے اغوا کرنے اور آگے چلانے کا ارادہ کر لیا۔ انہوں نے جمال شاہ سے کہا کہ لڑکی اُس کی ملکیت نہیں۔ وہ تو اغوا میں تھوڑی سی مدد کرے گا، اس لئے اُس کا اتنا حق نہیں جتنا وہ مانگ رہا ہے۔ جمال شاہ نے کہا کہ وہ لڑکی کی قیمت نہیں مانگ رہا بلکہ اُن کی واردات کی پردہ پوشی کی اُجرت مانگ رہا ہے۔

سودا تین ہزار روپے پر طے ہو گیا۔ ذہن میں یہ بھی رکھیں کہ میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اُس وقت کا تین ہزار روپیہ آج کے پچاس ہزار کے برابر تھا۔ طے یہ ہُوا کہ جمال شاہ لڑکی کو رات کے وقت بلائے گا اور اُسے کسی بہانے باہر لے جائے گا۔ قیمت جمال شاہ کو پہلے ادا

کر دی جائے گی۔ وہ تینوں لڑکی کو لے جائیں گے۔

جمال شاہ اُس کمرے میں چلا گیا جہاں اُس نے لڑکی کو بیٹھنے کے لئے کہا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس کی مُراد کی باتیں کر کے اُسے کہہ آیا کہ وہ دو روز بعد آدھی رات کے وقت اُس کے پاس آئے۔ وہ اُسے ایک وظیفہ کرائے گا جس میں ایک گھنٹہ صرف ہو گا۔ اُس نے لڑکی کو یہ شرط بتائی کہ وہ کسی کو بتا کر نہ آئے ورنہ وظیفہ اُلٹا ہو جائے گا۔ لڑکی کو اُس نے گھر بھیج دیا۔ اِن آدمیوں سے جمال شاہ نے کہا کہ وہ پوری قیمت لے کر فلاں رات آ جائیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ لڑکی کو لے جائیں گے ظفرے کو ساتھ کر دو۔ لڑکی فوراً بِک جائے گی۔ قیمت ملتے ہی تین ہزار روپیہ ظفرے کے ہاتھ بھیج دیا جائے گا۔ جمال شاہ کے بولنے سے پہلے ہی ظفرے نے یہ تجویز مسترد کر دی اور کہا کہ وہ قیمت پہلے لیں گے۔ اِن آدمیوں نے جمال شاہ اور ظفرے کو اپنے گروہ میں شامل ہونے کا مشورہ دیا اور کہا کہ وہ تین ہزار سے زیادہ بھی دے دیں گے بشرطیکہ وہ آئندہ بھی "مال" دیتے رہیں۔ جمال شاہ نے پیشکش رد کرتے ہوئے کہا کہ وہ بردہ فروش نہیں بننا چاہتا۔ وہ اپنی ساکھ اور شہرت کو خراب نہیں کرے گا۔

کوکھ سوکھ جائے گی

تینوں آدمی یہ کہہ کر چلے گئے کہ وہ رقم لے کر آجائیں گے ....

لڑکی اتنی زیادہ حاجت مند تھی کہ وہ جمال شاہ کی بتائی ہوئی رات کو آگئی۔ وہ جمال شاہ کی ہدایت کے مطابق گھر سے چوری چھپے آئی تھی۔ یہ تینوں آدمی پہلے سے آئے ہوئے تھے۔ جمال شاہ نے انہیں کہا کہ رقم نکالو۔ انہوں نے ایک ہزار روپیہ دیا اور کہا کہ باقی رقم لڑکی بک چکنے کے بعد ادا کی جائے گی۔ جمال شاہ نہ مانا۔ ظفرے کے بیان کے مطابق جمال شاہ ڈر بھی گیا تھا۔ اُس نے کہہ بھی دیا کہ وہ پہلے ہی گناہ گار ہے۔ لڑکی کو اغوا کرانے کا گناہ نہیں کرے گا۔ تینوں آدمیوں اور جمال شاہ نے اُس کی حوصلہ افزائی کی تو وہ مان گیا لیکن رقم پوری مانگتا تھا۔

آخر طے ہُوا کہ وہ لڑکی کو کل تک یہیں رکھے یا اسے پھر بلائے۔ وہ رقم لے آئیں گے۔ وہ چلے گئے۔ جمال شاہ کے دل و دماغ پر بلکہ اُس کی قسمت پر لڑکی کے حُسن وجمال کی مہر ثبت ہو گئی۔ اُس نے لڑکی کو کوئی الفاظ بتا کر کہا کہ پڑھتی رہے۔ اُس نے لڑکی پر اپنا طلسم طاری کرنے کے لئے اگربتیاں اور لوبان جلا دیا اور اپنی اداکاری بھی کی۔ صبح ہو گئی۔ لڑکی گھبرانے لگی۔ اُسے گھر جانا تھا۔ جمال شاہ نے اُسے کہا کہ تمہاری ماں اور ساس بھی کبھی کبھی اُس کے پاس آتی ہیں۔ میں ان دونوں سے کہہ آتا ہوں کہ تمہاری لڑکی میرے گھر میں وظیفہ کر رہی ہے اور اگر یہ وظیفہ اُدھورا چھوڑ دیا گیا تو اس کا اثر ایسا اُلٹا ہو گا کہ لڑکی کی کوکھ بالکل سُوکھ جائے گی اور دونوں گھروں کو ایسا نقصان ہو گا کہ ساری عمر پچھتاتے رہیں گے۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ غیب کا حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا

اور تقدیر انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے جو بُرے اعمال سے بُری اور اچھے اعمال سے اچھی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ خطا کی سزا اور کارِ خیر کی جزا دیتا ہے، مگر تعلیم کی کمی، مالی بدحالی اور بے بنیاد رسم و رواج نے لوگوں کو ایسا جکڑ رکھا ہے کہ وہ اپنی تقدیر ایسے افراد کے حوالے کر دیتے ہیں جو باتوں اور اداکاری سے اُن پر اپنا جادو چلا لیتے ہیں۔ ان کے جادو کو لوگوں کی ذہنی پسماندگی کامیاب کرتی ہے۔ ورد، وظیفے یا ٹونے ٹوٹکے کے کسی عمل کے اُلٹا ہو جانے سے سب ڈرتے ہیں۔

لڑکی بھی "اُلٹے اثر" سے ڈر گئی۔ اُسے ذرا سا بھی شک نہ ہُوا کہ اُس کی تقدیر اُلٹی ہو چکی ہے۔ اُس نے جمال شاہ سے کہا کہ وہ اُس کے میکے اور سُسرال میں بتا آئے کہ وہ یہاں ہے۔ جمال شاہ گھر سے نکل گیا اور گھوم پھر کر آ گیا۔ اُس نے لڑکی کو تسلی دی کہ وہ دونوں گھروں میں بتا آیا ہے۔

لڑکی کے خریدار اگلی رات نہ آئے۔ ظفرا اور جمال شاہ انتظار کرتے رہے۔ صبح ہُوئی تو جمال شاہ نے ظفرے سے کہا کہ وہ اُن آدمیوں کے گاؤں جائے۔ اگر انہوں نے ارادہ بدل دیا ہے یا اُن کے پاس رقم نہیں ہے تو وہ لڑکی کو گھر بھیج دے گا..... ظفرا چلا گیا۔ دن گزر گیا۔ ایک اور رات گزر گئی۔

ظفرا چونکہ جمال شاہ کے گھر سے غیر حاضر تھا، اس لئے اُسے معلوم نہیں تھا کہ پیچھے کیا ہوتا رہا ہے۔ یہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ انہی دنوں لڑکی کی ساس اور ماں الگ الگ جمال شاہ کے پاس گئی تھیں اور اُسے

کہا تھا کہ لڑکی لاپتہ ہے اور بتاتے کہ وہ کہاں چلی گئی ہے۔ جمال شاہ نے اپنے "علم" کے ذریعے حساب کتاب کر کے انہیں "غیب" کی یہ خبر سنائی تھی کہ لڑکی جہاں بھی گئی ہے اپنی مرضی سے گئی ہے اور اگر اُسے واپس لایا گیا تو وہ زندہ نہیں رہ سکے گی اور اُس کے خاوند کو بھی مالی اور جانی نقصان ہوگا۔ یہ لوگ ڈر گئے اور ایک ہندو جوتشی اور مسجد کے خطیب سے بھی پوچھا۔

میں نے ظفرے سے پوچھا کہ وہ اتنے دن ان آدمیوں کے ہاں کیا کرتا رہا ہے۔ اُس نے مجھ سے یہ بات چھپانے کی کوشش کی لیکن وہ میرے جال میں آچکا تھا۔ میں نے اُسے وعدہ معاف گواہ بنانے کا لالچ دے دیا۔ اُس نے بتایا کہ اُن لوگوں کے پاس رقم پوری نہیں تھی۔ وہ لڑکی کا سودا چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی اپنے کسی گاہک کے ہاں چلا گیا۔ چونکہ انہوں نے یہ کاروبار پہلے کبھی نہیں کیا تھا، اس لئے وہ اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ ان کا ساتھی خالی ہاتھ واپس آیا۔ اُسے گاہک نے کہا تھا کہ پہلے لڑکی لاؤ، دکھاؤ پھر قیمت طے ہوگی۔ قیمت مقرر کرتے وقت یہ بھی دیکھا جائے گا کہ وہ لڑکی کو گاہک کے ٹھکانے تک اپنی ذمہ داری پر پہنچائیں گے یا گاہک اُن کے ٹھکانے سے لڑکی کو لے جائے گا۔

بردہ فروشوں کی شرطیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

لڑکی کو لے گئے

انہوں نے ظفرے کو تین چار سو روپے کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ سکیم یہ بنی کہ ظفرا واپس جمال شاہ کے پاس جائے اور اُسے کہے کہ یہ تینوں اُس کے گھر سے کچھ دُور کھڑے ہیں۔ جمال شاہ لڑکی کو لے آئے اور ایک جگہ چل کر رقم لے لے اور لڑکی دے دے۔ ظفرے نے ایسے ہی کیا۔ وہ رات کو جمال شاہ کے گھر آیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ جمال شاہ کی چھوٹی بیوی گھر میں ہنگامہ بپا کر کے جمال شاہ سے اپنی پٹائی کرا چکی ہے اور جمال شاہ کی پہلی بیوی اُسے دیکھ رہی ہے۔

ظفرے کی دستک پر جمال شاہ باہر نکلا۔ اُس نے جمال شاہ کو بتایا کہ اُس کے تین دوستوں میں سے دو فلاں جگہ کھڑے ہیں کیونکہ وہ آگے آنے سے ڈرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لڑکی کو اپنے گھر سے دور ہمارے حوالے کر دو اور اپنی رقم لو۔ جمال شاہ اندر آیا۔ ظفرے کو معلوم نہیں تھا کہ وہ لڑکی کو کیا دھوکہ دے کر باہر لے آیا اور لڑکی اُس کے ساتھ چل پڑی۔ ظفرا اُس جگہ تک ساتھ گیا جہاں وہ آدمی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے جمال شاہ کو الگ کر کے کہا کہ اُن کا تیسرا آدمی آگے کھڑا ہے اور رقم اُس کے پاس ہے۔ دوسرے آدمی نے ظفرے کو الگ کر کے کہا کہ وہ واپس چلا جائے اور کل اُن کے گاؤں آجائے۔

ظفرا وہاں سے واپس آگیا۔ اُس نے قسمیں کھا کر کہا کہ اُسے بالکل علم نہیں تھا کہ وہ لوگ جمال شاہ کو قتل کر دیں گے۔ وہ حیران تھا کہ لڑکی کس جھانسے میں اُن کے ساتھ چلی گئی تھی۔ ظفرا واپس آ کر بہت دیر حویلی سے دور جمال شاہ کا انتظار کرتا رہا۔ آخر مایوس ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔ صبح وہ جمال شاہ سے ملنے آیا تو اُسے پتہ چلا کہ وہ تو قتل ہو گیا ہے۔ وہ بہت گھبرایا۔ اُس نے اُن آدمیوں کے گاؤں جانے کا ارادہ کیا لیکن وہ اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ آدمی جمال شاہ کو قتل کر گئے ہیں۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ رقم لے کر آرہا ہوگا اور کسی رہزن نے اُسے لُوٹ کر قتل کر دیا ہوگا۔ وہ سوچتا ہی رہا اور میرے ہاتھ آگیا۔ اُسے اُن آدمیوں نے چار سو روپیہ دیا تھا۔

ظفرے نے اُن کے گاؤں کا نام بتایا۔ وہ گاؤں دوسرے تھانے کا نہیں بلکہ دوسرے ضلعے کا تھا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ گاؤں وہاں سے پندرہ سولہ میل دُور تھا۔ ریل گاڑی تو جاتی تھی لیکن جس سٹیشن پر ہمیں اُترنا تھا وہاں سے وہ گاؤں چھ میل دُور تھا۔ میں نے گھوڑوں اور سائیکلوں کا استعمال بہتر سمجھا۔ پگڈنڈی بڑی اچھی تھی۔ میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں ظفرے کی باتوں سے جان گیا تھا کہ مجرم اناڑی ہیں۔ انہوں نے اناڑی پن کے کئی ثبوت پیش کئے تھے۔ اُن کی سب سے بُری حماقت یہ تھی کہ انہوں نے ظفرے کو چند سو روپے دے کر اُسے اپنے راز میں شامل

کیا مگر اُسے یہ نہ بتایا کہ وہ جمال شاہ کو قتل کریں گے۔ وہ ظفرے کو قتل میں بھی ساتھ رکھتے اور اُسے کچھ اور پیسے دے دیتے۔ وہ سمجھ ہی نہ سکے کہ یہ شخص اُن کی نشاندہی کر دے گا۔ بہرحال جیسے وہ کچے تھے ویسا ظفرا کچا نکلا۔

ہم نے محاصرہ کیا، لڑکی جاگ اُٹھی

میں نے دو گھوڑے لئے۔ ایک پر خود اور دوسرے پر ہیڈ کانسٹیبل کو سوار کیا۔ ظفرا سائیکل نہیں چلا سکتا تھا۔ اُس کے لئے ٹٹو لے لیا۔ چار کانسٹیبل ساتھ لئے۔ ان کے پاس سائیکلیں تھیں۔ ہم رات کے پہلے پہر اُس گاؤں کے تھانے میں پہنچ گئے۔ ایس۔ ایچ۔ او ایک ہندو راجپوت سب انسپکٹر سرجیت سنگھ تھا۔ اُسے واردات سنائی۔ ظفرے نے اُن آدمیوں کے نام بتائے۔ سرجیت سنگھ نے بتایا کہ ان میں سے ایک رہزنی میں تین سال سزائے قید کاٹ چکا ہے۔ سرجیت سنگھ نے بہت مدد کی۔ اُس نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی اور تین مسلح کانسٹیبلوں کو ساتھ کر دیا۔

وہاں سے گاؤں تین میل دُور تھا۔ ہم جب وہاں پہنچے گاؤں پر موت کی خاموشی طاری تھی۔ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ تھوڑی سی نفری سے ہی گھیرا مکمل ہو گیا۔ چوکیدار نے ہمیں اُس آدمی کا گھر بتایا جس کے متعلق سرجیت سنگھ نے کہا تھا کہ رہزنی میں سزا یافتہ ہے۔ ظفرا ہمارے ساتھ

تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ دوسری دستک پر کھُلا۔ اے۔ ایس۔ آئی کی ٹارچ کی روشنی میں مجھے ایک آدمی نظر آیا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے اُسے اندر کو دھکیلا اور خود بھی اندر چلا گیا۔ میں اور ہیڈ کانسٹیبل اُس کے پیچھے اندر گئے۔ یہ ڈیوڑھی تھی۔ اے۔ ایس۔ آئی نے دروازہ کھولنے والے کو وہاں روک لیا۔

"جبّو!" ــــ اُس نے اُس آدمی سے کہا ــــ "لڑکی ہمارے حوالے کر دو۔"

جبّو نے پس و پیش کی۔ میں نے پوری طاقت سے اُس کے مُنہ پر تھپّڑ مارا۔ وہ دیوار سے جا لگا۔ میں نے کہا ــــ "ہم تمہارا بیان لینے نہیں لڑکی لینے آئے ہیں" ــــ میں نے اُسے بالوں سے پکڑا اور اُس کا چہرہ ٹارچ کی روشنی میں کر کے ظفرے سے کہا ــــ "یہی ہے؟"

"ہاں جی!" ــــ ظفرے نے جواب دیا۔

جبّو نے ظفرے کو بڑی گندی گالی دی اور اندر کو چل پڑا۔ ہم اُس کے پیچھے گئے۔ ایک کمرے کے باہر تالا لگا ہوا تھا۔ جبّو نے کھولا۔ اندر لڑکی سوئی ہوئی تھی۔ ہماری آوازوں سے اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھی اور چلّا کر بولی ــــ "ظالمو! مجھے چھوڑ دو۔ خدا سے ڈرو۔"

میں نے آگے ہو کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا ــــ "ہم تمہیں ان ظالموں سے چھڑانے آئے ہیں۔"

پولیس کی وردی دیکھ کر وہ چارپائی پر بیٹھ گئی اور لڑھک گئی۔

یہ خوشی کا دھچکہ تھا جس سے اُسے غشی آ گئی تھی۔ جلدی ہوش میں آ گئی۔

"دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟" ــــ میں نے جبّو سے پوچھا۔

اُس کی نشاندہی پر ہم نے دو مختلف گھروں سے اُس کے دونوں ساتھیوں کو پکڑ لیا۔ ظفرے نے انہیں بھی پہچان لیا۔ لڑکی کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ وہ اُس سے زیادہ دلکش ہے جتنی بتائی گئی تھی۔ ہم نے قتل کے آلات بھی برآمد کر لئے۔ ایک چاقو تھا اور ایک لاٹھی۔ برآمدگی کے کاغذات تیار کرتے اور گاؤں کے گواہ بناتے آدھی رات ہو گئی۔ ہم نے باقی رات تھانے میں گزاری اور صبح وہاں سے روانہ ہوئے۔

چار دیواری کی دُنیا میں

اپنے تھانے میں پہنچ کر لڑکی کے والدین، اُس کے خاوند، سُسر اور ساس کو بلایا۔ لڑکی کی ذہنی حالت بہت بُری تھی۔ چونکہ وہ لڑکی تھی اس لئے اُسے یہ غم بھی تھا کہ اُس کے لواحقین اور محلّے برادری کے لوگ اُسے بدنام کریں گے اور خاوند تو شاید اُسے اب قبول ہی نہ کرے۔ پولیس کا کام تفتیش اور پھر مقدمہ قائم کر کے عدالت میں پہنچانے تک ختم ہو جاتا ہے۔ جرم کے بعد کے اثرات اور جرم کی زد میں آنے

والوں کی بعد کی حالت اور لوگوں کے گھروں کے حالات کے ساتھ پولیس کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ پولیس کے لئے یہ ممکن بھی نہیں ہوتا۔ میں کچھ جذباتی سا آدمی تھا۔ مسلمانوں کے نیک و بد کا مجھے زیادہ خیال رہتا تھا۔ میں نے اپنے سرکاری فرائض سے ہٹ کر یہ کارروائی کی کہ لڑکی کے خاوند کو الگ بلا کر شرمسار کیا اور اُسے برا بھلا بھی کہا اور اُسے بتایا کہ وہ لڑکی کو اولاد کی خاطر دوسری شادی کی دھمکی نہ دیتا تو یہ لڑکی اس حال تک نہ پہنچتی۔ میں نے اُسے کہا کہ اگر اُس نے لڑکی کو پریشان کیا یا اُسے طلاق کی دھمکی دی تو میں اُسے حوالات میں بند کر دوں گا۔

میں نے اُسے ڈرانے کے لئے دھمکی دی تھی۔ میں عملاً اُس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس خاوند کے باپ اور اُس کی ماں اور لڑکی کے باپ اور اُس کی ماں کو سامنے بٹھا کر بہت شرمسار کیا۔ اُس کی ساس کو تو میں نے بُری سنائیں۔ ان سب سے کہا کہ انہوں نے غیب کے علم اور عامل کی حیثیت دیکھ لی ہے۔ تم خود جمال شاہ کے پاس جاتے رہے اور اتنی خوبصورت لڑکی کو بھی وہاں لے جاتے رہے۔ لڑکی اس نوسرباز کے جال میں آگئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ اُن کی خوش قسمتی ہے کہ جلدی سراغ مل گیا اور میں پہنچ گیا، ورنہ لڑکی انہیں ساری عمر نہ ملتی۔

میں دیکھ رہا تھا کہ یہ لوگ شرمسار تو ہو رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ اپنی ڈگر سے ہٹیں گے نہیں۔ عاملوں، جوتشیوں اور رمل فال والوں

کو یہ لوگ اپنے دل سے اتار نہیں سکتے۔ یہ لوگ مسلمان ہوتے ہوئے بھی تسلیم نہیں کرتے کہ مسلمان کے پاس قرآن پاک ایسا تعویذ ہے جو دنیا کا نقشہ اُلٹ سکتا ہے بشرطیکہ یہ لوگ سمجھیں کہ اس مقدس کتاب میں خداوند تعالیٰ نے کیا کہا ہے۔ بہرحال میں نے ان سب کو ڈرایا دھمکایا کہ وہ لڑکی کو مظلوم سمجھیں، اسے سینے سے لگائیں اور اسے پریشان نہ کریں۔

اس کے بعد میں نے لڑکی کا بیان لیا۔ وہ روتی زیادہ اور بولتی کم تھی۔ میری ہمدردانہ حوصلہ افزائی سے اُس نے طویل بیان دیا جس کا اختصار یہ ہے کہ اُسے اپنے خاوند سے دلی محبت تھی مگر خاوند وہمی ثابت ہوا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بیویاں اپنے خاوندوں پر جانیں نثار کرتی ہیں مگر بعض خاوند محبت کا جواب محبت سے دینے کی بجائے بیویوں کو زرخرید لونڈیاں سمجھ لیتے ہیں اور اُن سے عورتوں کی طرح نازبرداریاں کراتے ہیں اور اُن سے اپنی جائز اور ناجائز باتیں منواتے رہتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی سلوک اس لڑکی کے ساتھ خاوند نے کیا۔

لڑکی کی ساس کو یہ غم کھا رہا تھا کہ اس لڑکی نے اُس کے بیٹے پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ ان دونوں کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اس ذہنیت کی ساسیں کیسی کیسی حرکتیں کیا کرتی ہیں۔ بلاوجہ مُنہ بسورے رکھنا اور اپنے بیٹے پر یہ ثابت کرنا کہ وہ اُس کی بیوی سے بہت تنگ ہے۔ لڑکی چونکہ زندہ مزاج تھی اس لئے اُس نے اس پر بدچلنی کا شبہ کرنا

شروع کر دیا جب بیٹا اپنی ماں کے زیرِ اثر ہو گیا تو ساس نے بہو پر کُھل کر حملے شروع کر دیئے۔ اس کے نتیجے میں ساس بہو میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔

ماں نے بیٹے کے کان میں ڈالی کہ شادی ہوئے دو سال ہو گئے ہیں، ابھی بچہ پیدا ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔ ماں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس لڑکی میں بچہ پیدا کرنے کی اہلیت ہی نہیں۔ یہ بھی لڑکی کو پریشان کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ ساس نے چار دیواری میں بند رہنے والی عورتوں کی طرح اپنی زبان بے لگام کر رکھی تھی۔ اُس نے دو تین عورتوں سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کی دوسری شادی کرائے گی۔ یہ بات لڑکی کے کانوں تک پہنچی تو وہ تڑپ اُٹھی۔ کچھ دنوں بعد اُس کے خاوند نے بھی یہی کہنا شروع کر دیا۔

یہاں میں کچھ اپنی رائے میں کہوں گا۔ اُس نے دوسری شادی کی جو بات پھیلائی تھی، یہ اُس کا فیصلہ نہیں تھا۔ یہ اُس نے صرف اس لئے کہا تھا کہ یہ بات اُس کی بہو اور بہو کی ماں تک پہنچے اور وہ ڈر کر اُس کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔ ہماری عورتیں جو مُنہ میں آتے اُگلتی رہتی ہیں وہ کوئی فیصلہ نہیں کیا کرتیں کیونکہ فیصلہ خواہ اچھا ہو یا بُرا، ہو جاتے تو چار دیواری کی دنیا کی رونق ختم ہو جاتی ہے۔ لڑکی کے خاوند نے بھی لڑکی کو زیر کرنے کے لئے اپنی ماں کی بات دُہرائی تھی۔

لڑکی کے سامنے دو مسئلے تھے۔ ایک یہ کہ وہ خاوند کو دلی طور پر

چاہتی تھی۔ دوسرا یہ کہ وہ طلاق لے کر اپنے ماں باپ کے لئے ایک روگ بننے سے ڈرتی تھی۔ اُس کی ماں نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ تو طلاق کے نام سے ڈرتی تھی۔ لوگ اصل وجہ تو دیکھتے نہیں، طلاق لینے والی کو بدنام کر دیتے ہیں۔ ہر کسی کے مُنہ سے نئی سے نئی کہانی نکلتی ہے۔

رات وظیفے میں گزر گئی

لڑکی نے اپنی ماں سے بات کی۔ ماں اُسے جمال شاہ کے پاس لے گئی۔ جمال شاہ نے انہیں مژدہ سُنایا کہ اولاد ضرور ہو گی لیکن ایک عمل کرنا پڑے گا۔ اُس نے ماں بیٹی کو تعویذ بھی دیا اور ایک ٹونہ بھی بتایا اور کہا کہ لڑکی اُس کے پاس ایک بار پھر آئے۔ لڑکی ایک روز اپنی ساس کو بتا کر جمال شاہ کے پاس گئی۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس روز جمال شاہ کے پاس کوئی آدمی بیٹھے ہوئے تھے؟

"اُس کے پاس چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "میں ان میں سے صرف ایک کو پہچانتی ہوں کیونکہ اس کمرے میں داخل ہوئی تو اُس کا مُنہ میرے سامنے تھا۔"

یہ انہی تین آدمیوں میں سے تھا جو جمال شاہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے لڑکی کا سودا کیا تھا۔ چوتھا آدمی ظفرا تھا۔ لڑکی نے

بتایا کہ جمال شاہ نے اسے دوسرے کمرے میں بٹھا دیا اور کچھ دیر بعد اس کے پاس گیا اور اسے کچھ پڑھنے کو کہا۔ وہ اسے وظیفے کی طرح پڑھتی رہی۔ پھر آکر اُسے دو روز بعد کی ایک رات کا وقت بتا کر کہا کہ وہ اس طرح آئے کہ گھر میں کسی کو پتہ نہ چلے ورنہ عمل اُلٹا ہو جائے گا۔ لڑکی طلاق سے اس قدر خوفزدہ تھی کہ آدھی رات سے کچھ دیر پہلے جب سب گھری نیند سو گئے تھے، وہ رومال میں کچھ پیسے باندھ کر دبے پاؤں گھر سے نکل گئی۔ اسے امید تھی کہ رات کو ہی وہ واپس آجائے گی لیکن جمال شاہ نے اسے جو وظیفہ بتایا وہ اتنا لمبا تھا کہ رات گزر گئی۔

اس نے گھر جانے کو کہا تو جمال شاہ نے اسے [illegible]ں کہیں جو ظفرے کے بیان میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ جمال شاہ نے اسے یقین دلا دیا کہ وہ اس کے میکے اور سسرال میں بتا آیا ہے کہ لڑکی اُس کی بیویوں کے پاس ہے۔ میرے پوچھنے پر لڑکی نے بتایا کہ جمال شاہ نے اُس کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت نہیں کی۔ اگر کرتا تو لڑکی یہ سمجھ کر وہاں سے بھاگ جاتی کہ یہ وظیفہ محض فریب ہے۔ لڑکی کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ جمال شاہ اس کا سودا کر چکا ہے۔

ایک رات وہ زیادہ پریشان ہو گئی۔ وہ رو بھی پڑی۔ اُس نے جمال شاہ سے کہا کہ وہ اور زیادہ یہاں نہیں رہے گی۔ جمال شاہ اسے تسلیاں دیتا رہا۔ یہ وہ باتیں تھیں جو جمال شاہ کی پہلی بیوی نے اس کمرے کے دروازے کے ساتھ کان لگا کر سنی تھیں۔ اُسی رات جمال شاہ کی

دوسری بیوی نے ہنگامہ کیا تھا اور اُسی رات ظفرا مجرموں کے گاؤں سے واپس آیا۔ لڑکی کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ جمال شاہ کی موت سارے انتظامات مکمل کر رہی تھی۔

لڑکی نے بیان میں کہا کہ جمال شاہ اُسے تسلی دلاسہ دے کر باہر چلا گیا کیونکہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ واپس آکر اُس نے لڑکی سے کہا کہ چلو، تمہارا وظیفہ آج ختم کر دیتا ہوں لیکن ایک اور عمل کرنا ضروری ہے۔ عمل یہ بتایا کہ یہاں سے تھوڑی دور ویرانے میں جا کر چاندنی میں آسمان کی طرف منہ کر کے کچھ پڑھنا ہے۔ لڑکی نے مجھے بتایا کہ اس شخص کی باتوں اور انداز میں ایسا تاثر تھا کہ وہ اس کے آگے بول نہیں سکتی تھی۔ اس کے پاس کوئی غیبی طاقت ضرور تھی۔ یہ میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ جمال شاہ کامیاب ایکٹر تھا۔ وہ لڑکی کو مسحور کر لیتا تھا۔ اسے آپ ہپناٹائز ہونا بھی کہہ سکتے ہیں۔

جمال شاہ اُسے یہ تسلی دے کر ساتھ لے گیا کہ یہ عمل پورا کر کے وہ خود اُسے گھر چھوڑ آئے گا۔ وہ اتنی مجبور ہو چکی تھی کہ اُس کے ساتھ چل پڑی۔ آگے جا کر اُسے چاندنی میں دو آدمی کھڑے نظر آئے۔ جمال شاہ نے لڑکی سے کہا کہ یہ میرے دوست ہیں، تم آہستہ آہستہ چلو، میں آتا ہوں۔ لڑکی کچھ ڈری لیکن چلتی گئی۔ جمال شاہ نے ظفرے کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ وہ ان دونوں کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ جمال شاہ نے ظفرے کے متعلق لڑکی سے کہا تھا کہ رات کا وقت ہے کسی کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

پہلے لاٹھی چلی پھر چاقو

جمال شاہ ان کے ساتھ دو چار منٹ باتیں کر کے لڑکی سے آ ملا۔ لڑکی نے گھوم کر دیکھا۔ وہ دونوں آدمی پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ ظفر انظر نہیں آتا تھا۔ کچھ دُور آگے گئے تو لڑکی کو دھمک کی آواز سنائی دی۔ اُس نے دیکھا کہ جمال شاہ رُک گیا اور گر پڑا۔ جمال شاہ کے سر پر کپڑے کی ٹوپی تھی۔ پیچھے سے ایک آدمی نے اُس کے سر پر لاٹھی ماری تھی۔ لڑکی گھبرا گئی۔ ایک آدمی نے جمال شاہ کے پیٹ میں چاقو پھیر دیا۔ اب وہ تین آدمی تھے۔ تیسرا آدمی ظفر انہیں تھا۔ ظفر او ہاں تھا ہی نہیں۔ تیسرا آدمی کہیں سے چھپا ہوُا نکلا تھا۔

ایک آدمی نے چاقو لڑکی کو دکھا کر کہا کہ وہ خاموشی سے اُن کے ساتھ چلی چلے ورنہ اُسے پہلے خراب کیا جائے گا پھر قتل کر دیا جائے گا۔ لڑکی کے خوف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ ان آدمیوں نے جمال شاہ کو قتل کر کے تین ہزار روپیہ بچا لیا ہے اور وہ لڑکی کو مفت لے جا رہے ہیں۔ لڑکی ان کے ساتھ چل پڑی۔ تھوڑی دور جا کر لڑکی کا دماغ خوف سے آزاد ہو گیا۔ وہ دوڑ پڑی۔ دو آدمیوں نے اسے پکڑ لیا اور اسے بازوؤں اور کندھوں سے پکڑ کر اس طرح گھسیٹنے لگے کہ اُس کی ایڑیاں زمین پر گھسیٹی جاتی رہیں۔ میرے پوچھنے

پر اُس نے بتایا کہ پہلے اُس کا ایک سینڈل اُترا، پھر دوسرا بھی اُتر گیا۔

ایک جگہ رُک کر ان آدمیوں نے اسے ڈرایا بھی اور یہ بھی کہا اُس کے ساتھ کوئی ظلم نہیں ہو گا بلکہ اسے ایک شہزادے جیسے آدمی کے پاس لے جایا جا رہا ہے جسے اُس جیسی خوبصورت بیوی کی ضرورت ہے اور وہ ملکہ بن کر عیش کرے گی۔ لڑکی لالچ میں نہ آئی۔ وہ آزاد ہونے کی کوشش کرتی رہی۔ آخر ایک آدمی نے اسے کمر سے دبوچ کر اُوپر کو اچھالا اور کندھے پر ڈال لیا۔ میں نے اس سے دوپٹے کے متعلق پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اُس کا دوپٹہ درخت کے ساتھ اٹک کر اُتر گیا تھا۔

اُسے گاؤں میں لے گئے اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ وہ روتی اور چیختی تھی۔ ایک آدمی اُسے ڈراتا بھی تھا اور لالچ بھی دیتا تھا۔ دن گزر گیا۔ رات کو بھی دھمکیوں اور لالچ کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر اُس کی آنکھ لگ گئی۔ ہماری آوازوں پر اُس کی آنکھ کھُلی۔

اُس آدمی کا نام حیدر تھا جس کے قبضے سے لڑکی برآمد ہوئی تھی۔ لڑکی کے بیان کے مطابق جمال شاہ کے پیٹ میں چاقو اسی نے مارا تھا۔ یہی رہزنی میں سزا یافتہ تھا۔ میں نے حیدر سے پوچھا کہ وہ اقبالی بیان دے گا؟ اُس نے انکار کر دیا۔ میں نے اقبالی بیان پر زور بھی نہ دیا۔ اس کے ساتھیوں نے لڑکی کے بیان کی تصدیق میں اقبالی بیان دے دیئے لیکن ان میں کچھ کمزوریاں تھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ بری ہو

جائیں۔ میں نے ظفرے کو حوالات میں بند کر دیا تھا۔ اسے استعمال کرنا زیادہ بہتر سمجھا۔ مجرموں کو سزا دلانے کے لئے تھوڑی سی بناوٹ کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ میں نے ظفرے کو قتل کی واردات میں شامل کر لیا اور اسے وعدہ معاف گواہ بنا لیا۔ اسے بیان یاد کرا دیتے۔ لڑکی عینی شاہد تھی۔ اس نے جو دیکھا تھا وہ میں نے ظفرے کو بتا دیا۔ اس طرح دو عینی شاہد ہو گئے۔ ظفرے نے پورا تعاون کیا۔

ظفرا وعدہ معاف گواہ تھا اس لئے سزا سے بچ گیا۔ باقی تین آدمیوں کو قتل میں عمر قید اور دو دو دفعات میں پانچ پانچ اور تین تین سال مزید سزائے قید دی گئی۔

دل دیوانہ پیار کے پتھر

واردات جو میں سنانے لگا ہوں، آپ کے لئے عجیب اور حیرت انگیز نہیں ہوگی۔ اس کا عجیب پہلو صرف یہ ہے کہ اس کی تفتیش ہوئی تھی۔ ایسی وارداتوں کی رپورٹ تھانوں میں نہیں جایا کرتی۔

یہ انبالہ کے قائمقام انگریز ڈپٹی کمشنر بی۔ جی سمتھ کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ ہم نے جنات اور کالے علم کے جادوگروں کے خلاف تفتیش کی۔ ہمارا اس ضلعے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا لیکن سمتھ کی کوششوں سے یہ کیس سی۔ آئی۔ اے کے ایک انگریز انسپکٹر ایس۔ ایف گرے کو دیا گیا اور گرے نے مجھے اپنے ساتھ لے لیا۔ حکم کے مطابق ہم دونوں انبالہ چلے گئے۔ سمتھ سے ملے تو میرے نام سے اسے پتہ چلا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کیا اسلام میں کالا علم اور تعویذوں یا کسی عمل کے ذریعے کسی کو نقصان پہنچانا بھی شامل ہے؟ — اس نے لفظ WITCHCRAFT استعمال کیا تھا جو افریقہ کے حبشیوں کی ایجاد ہے اور آج بھی وہاں یہ عمل چلتا ہے۔

میں نے اُسے بتایا کہ اسلام میں کالے علم اور کسی بھی پُراسرار عمل سے کسی کو نقصان پہنچانے کو گناہِ کبیرہ کہا گیا ہے ——— میرا یہ جواب سُن کر اُسے جیسے اطمینان ہوا ہو۔ اُس نے بتایا کہ وہ ڈیڑھ سال افریقہ کے اُس علاقے میں رہا ہے جو آج کل یوگنڈہ ہے۔ اُس نے وہاں "وِچ کرافٹ" میں بہت دلچسپی لی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ یہ ایک عمل ہے جس سے وہاں بیماریوں کا علاج کیا جاتا تھا۔ مجرموں کا سراغ لگایا جاتا تھا اور اسی عمل سے اپنے کسی دشمن کو نقصان بھی پہنچایا جاتا تھا۔ اس عمل کے عامل بہت تھوڑے تھے۔ انگریزوں نے انہیں "وِچ ڈاکٹر" بھی کہا ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ WITCH کو اُردو میں جادوگرنی کہتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس عمل کو جادوگرنیوں سے منسوب کیا گیا ہے۔ سمتھ نے بتایا تھا کہ افریقہ میں زیادہ تر وِچ ڈاکٹر عورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو ان کی شکل وصورت اور رنگت ہی ڈراؤنی سی ہوتی ہے لیکن وِچ ڈاکٹر عورتوں کے چہرے بڑے ہی بھیانک ہوتے ہیں۔ وہ جب یہ پُراسرار عمل کرتی ہیں تو اپنی بھیانک صورت کو اور زیادہ ہیبت ناک بنا لیتی ہیں۔

"میں جب وہاں تھا تو میں نے وہاں کی برطانوی حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ اس عمل سے دوسروں کو نقصان پہنچانے والوں کو سزا دی جاتے" ——— سمتھ نے کہا ——— "ہماری حکومت نے اس پر توجہ دی اور ایک وِچ ڈاکٹر کو پکڑا جس کو ایک آدمی نے فیس دے کر اپنے ایک دشمن کو ایک ایسی بیماری میں مبتلا کر دیا تھا جس کا علاج کوئی انگریز ڈاکٹر نہ کر سکا۔

ہماری پولیس نے عمل کرنے والی کا سراغ لگا لیا تھا مگر اُسے گرفتار کیا تو وہاں کے باشندوں نے شدید احتجاج کیا۔ بعض نے ہمیں ڈرایا دھمکایا کہ اگر ہم نے وِچ کرافٹ میں مخالفانہ دخل اندازی کی تو ہم بھی اس کی زد میں آجائیں گے۔ ہماری حکومت نے فیصلہ کیا کہ ان لوگوں کے عقیدوں اور توہمات کو نہ چھیڑا جائے۔"

میں اس کی باتیں غور سے سُن رہا تھا اور اپنے آپ کو ذہنی طور پہ کسی بڑی ہی پیچیدہ تفتیش کے لئے تیار کر رہا تھا۔ میں اتنا جان گیا کہ یہاں کسی نے کسی کو جادو یا کالے علم کے ذریعے نقصان پہنچایا ہے۔

"میں نے یہاں آکر بھی دیکھا ہے کہ بعض لوگ ایسا ہی کوئی عمل کرتے ہیں جس سے دوسروں کو نقصان پہنچایا جاتا ہے" ——— سمتھ نے کہا ——— "مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ مسلمانوں میں زیادہ چلتا ہے۔ میں نیا نیا یہاں آیا تو مجھے بتایا گیا تھا کہ توہم پرستی ہندوؤں میں زیادہ ہے لیکن مسلمان بھی توہم پرست ہیں۔ میں نے ایک سال میں یہاں کے دیہات کا جو جائزہ لیا ہے، اس سے میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ یہاں بھی افریقہ والا وِچ کرافٹ چلتا ہے۔ میں پنجاب کے شمالی علاقوں میں بھی رہا ہوں۔ وہاں کے دیہات کے لوگ بلکہ قصبوں اور شہروں کے لوگ بھی دوائیوں کی بجائے تعویذوں اور دم درود سے علاج کراتے ہیں۔ اولاد پیدا کرنے کے لئے تعویذ اور دشمنوں کی اولاد کو مارنے کے لئے بھی تعویذ استعمال ہوتے ہیں ..... میں آپ کے مذہب میں

دخل نہیں دینا چاہتا۔ اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی ڈیوٹی آپ کے مذہب کے خلاف ہے تو میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ آپ یہ تفتیش ترک کر دیں۔ اگر مجھے آپ یہ مشورہ دیں گے کہ اس واردات کی تفتیش آپ کے مذہب میں دخل اندازی ہے تو میں تفتیش ترک کر دوں گا میں آپ کو علاقے کے ڈی۔ایس۔پی سے ملواؤں گا۔"

یہاں میں آپ کو انگریزوں کے متعلق ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ یہ انگریز افسر افریقہ میں گیا تو وہاں کے لوگوں کے توہمات اور رسم و رواج کی گہرائی تک گیا۔ ہندوستان میں آیا تو اس نے یہاں کے معاشرتی حالات کا گہرا جائزہ لیا۔ انگریزوں میں یہ خوبی تھی کہ جس علاقے میں تعینات ہوتے تھے وہاں کی زبان سیکھتے، وہاں کے مذہبوں، عقیدوں، تعصبات اور توہمات کا مطالعہ کرتے اور لوگوں کی نفسیات تک دیکھ لیتے تھے۔ پھر وہ وہاں کے لوگوں کے ساتھ اس کے مطابق سلوک کرتے اور ان کے عقیدوں وغیرہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ برِصغیر کے عوام آج تک انگریزوں کے دورِ حکومت کو یاد کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہماری یہ حالت ہے کہ ہمارے اپنے لیڈر جو برسرِاقتدار آئے، اپنی ہی قوم کی بداعتمادی اور نفرت کے مجسمے بنے۔ یہ لیڈر جس قوم کی پیداوار ہیں، اُس کی نفسیات اور ضروریات کو نہ سمجھ سکے۔

پُراسرار پتھر اور آگ

سمتھ نے مجھے جب کہا کہ میری ڈیوٹی میرے مذہب کے خلاف ہوتی تو میں تفتیش ترک کر دوں، میں نے اُس سے پوچھا کہ واردات کیا ہے۔ اُس نے اختصار سے بتایا کہ اُس کے دفتر میں چوہدری ناصر علی ایک ملازم ہے۔ (مجھے اصلی نام یاد نہیں رہا۔ کچھ اسی قسم کا تھا)۔ اس کے گھر پتھر پڑتے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے سات آٹھ پتھر صحن میں گرتے ہیں جیسے کوئی باہر سے پھینکتا ہے۔ اتنے ہی پتھر رات کو بھی صحن میں گرتے ہیں۔ چھ سات دنوں بعد سنگباری کے ساتھ یہ خوفناک سلسلہ شروع ہو گیا ہے کہ کھونٹی کے ساتھ لٹکے ہوئے کسی کپڑے کو آگ لگ جاتی ہے۔ گھر والے آگ بجھاتے ہیں۔ آدھا کپڑا جل چکا ہوتا ہے۔ یہاں تک ہوا ہے کہ کپڑے دھو کر رسیوں پر لٹکائے جاتے ہیں تو ان میں سے ایک یا دو کپڑوں کو آگ لگ جاتی ہے حالانکہ کپڑوں سے پانی ٹپک رہا ہوتا ہے۔

"ناصر علی نے مجھے بتایا تو میں اس انوکھی واردات پر حیران نہ ہوا" —سمتھ نے کہا— "افریقہ میں تو دشمن کو نقصان پہنچانے کا یہ طریقہ عام چلتا تھا۔ میں نے یہاں آکر بھی ایسے تین چار واقعات سُنے تھے اور لوگوں میں عاملوں، پیروں، فقیروں، سادھوؤں اور درویشوں کی مقبولیت اور عقیدت دیکھی تھی۔ یہ وِچ کرافٹ کا ایک اور کیس تھا۔ میں نے ناصر علی

سے کہا کہ وہ اپنے تھانے رپورٹ درج کرائے کہ کوئی دشمن اسے پریشان کر رہا ہے۔ میں نے علاقے کے ڈی۔ ایس۔ پی سے کہا کہ وہ متعلقہ تھانیدار کو سختی سے حکم دے کہ اپنے توہمات اور عقیدوں سے ہٹ کر تفتیش کرے۔ تھانیدار ہندو ہے۔ اُس نے تفتیش شروع کر دی تھی۔ اتنے میں کپڑوں کو آگ لگنے لگی۔ میں نے ڈی۔ ایس۔ پی کے ساتھ رابطہ رکھا۔ تھانیدار کے ساتھ میری صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ تفتیش میں ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ وہ کچھ خوفزدہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ کسی انسان کا نہیں جنّوں کا کام ہے۔ ہم لوگ بدروحوں کو مانتے ہیں لیکن بدروحیں یوں کسی کے گھر پتھر نہیں پھینکا کرتیں نہ آگ لگاتی ہیں۔ کسی کسی کی بدروح GHOST رات کو اس طرح نظر آتی ہے جس طرح یہ انسان اپنی زندگی میں ہوتا تھا۔ اس ملک میں لوگ جنّوں اور چڑیلوں کو مانتے ہیں۔ میں نے عجیب وغریب کہانیاں سنی ہیں۔ آپ تفتیش شروع کر دیں" ____ اُس نے مسکرا کر کہا ____ "اگر یہ جن ہوئے تو تفتیش چھوڑ دینا۔ آپ جنّوں کو گرفتار نہیں کر سکیں گے۔ آپ ناصر علی سے ملیں اور اپنا کام شروع کر دیں، لیکن آپ کو سب سے پہلے علاقے کے ڈی۔ ایس۔ پی کے پاس جانا پڑے گا۔"

ناصر علی دفتر میں ہی تھا۔ سمتھ کے دفتر سے اُٹھ کر ہم اُسے ملے اور اُسے ساتھ لے کر ہم ڈی۔ ایس۔ پی کے دفتر میں چلے گئے۔ انسپکٹر گرے نے اپنا اور میرا تعارف کرایا اور بتایا کہ ہم قائم مقام ڈپٹی کمشنر سے

مل آتے ہیں۔

"یہ اُسی کی ضد تھی کہ اس واقعہ کا پس منظر جو کچھ بھی ہے، تحقیقات ضرور ہونی چاہیئے" ____ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا ____ "میں بھی یہی چاہتا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ ہندوستانیوں کو ان سادھوؤں اور درویشوں وغیرہ کے جال سے نکالنا ناممکن ہے" ____ اُس نے ہمیں کچھ ہدایات دیں اور حوصلہ افزائی بھی کی اور ہر طرح کے تعاون کا یقین بھی دلایا۔

انگلیوں کے نشان نہیں تھے

ہم ناصر علی کے ساتھ اُس کے گھر چلے گئے۔ وہ شہر کے علاقے میں رہتا تھا۔ انبالہ انگریزوں کی بہت بڑی چھاؤنیوں میں سے تھا۔ آج کل تو انبالہ ہمارے لاہور اور کراچی کی صورت اختیار کر گیا ہوگا۔ میں جس دور کی کہانی سنا رہا ہوں، اُس وقت شہر کا علاقہ الگ اور چھاؤنی کا الگ ہوتا تھا۔ شہر ہمارے قدیم شہروں کی طرح گنجان اور غلیظ تھا۔ ناصر علی کرائے کے مکان میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ انبالہ سے پینتیس چالیس میل دُور کے کسی گاؤں یا قصبے کا رہنے والا تھا۔

ہم نے اُس کا مکان اندر، باہر اور اُوپر جا کر دیکھا۔ یہ مسلمانوں کا محلہ تھا۔ ہم چھت پر تھے تو صحن میں ایک پتھر گرا۔ ہم نیچے گئے۔ پتھر گر کر جدھر گیا تھا اُدھر سے ہم نے تعین کیا کہ کس طرف سے آیا ہے۔ گلی

کشادہ بھی۔ باہر ہمارے دو کانسٹیبل کھڑے تھے۔ جدھر سے پتھر آیا تھا اُدھر مسلمانوں کے گھر تھے۔ ناصر علی کے مکان کی ایک ہی منزل تھی۔ پتھر آسانی سے صحن میں آسکتے تھے۔ ہم نے ناصر علی سے پوچھا کہ جدھر سے یہ پتھر آیا ہے، کیا اُدھر کے رہنے والوں میں سے کسی کے ساتھ اُس کی دشمنی ہے؟

"نہیں"— اس نے جواب دیا —"یہ سب شریف لوگ ہیں۔ میری کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں"۔

ہم نے پتھر دیکھا۔ یہ پاؤ ڈیڑھ پاؤ وزن کا عام سا پتھر تھا۔ ہمارے پاس تفتیشی بیگ تھا۔ اس میں بہت سی اشیاء ہوتی تھیں۔ ان میں آتشی شیشہ بھی ہوتا تھا اور ان اشیاء میں ایک پاؤڈر اور خاص قسم کا ایک کاغذ ہوا کرتا تھا۔ یہ دونوں چیزیں کسی چیز پر انگلیوں کے نشان واضح کرنے کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ اتفاق سے پتھر کھُردرا نہیں تھا۔ تقریباً بالکل ہموار اور صاف تھا۔ انسپکٹر گرے اس فن کا ماہر تھا۔ اُس نے بہت وقت صرف کرکے پتھر کو دیکھا اور وثوق سے کہا کہ اس پتھر پر انگلیوں کے نشان نہیں ہیں۔

"اس پتھر کو ماہرین کے پاس بھیج دو"— اُس نے کہا —"سائنسی طریقوں سے دیکھ لو۔ اس پر انگلیوں کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔ یہ پتھر انسانی ہاتھوں نے نہیں پھینکا"۔

ہم ایک کمرے میں جا بیٹھے اور ناصر علی سے پوچھ گچھ شروع کر

دی۔ اُس نے بتایا کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں۔ میں نے اسے کہا کہ یہ ہوسکتا ہے کہ محلے اور برادری میں اس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہ ہو۔ دفتر میں ترقی کے سلسلے میں یا کسی اور وجہ سے اس کا کوئی دشمن ہوگا۔ اُس نے جائز یا ناجائز طور پر کسی ملازم کو نقصان پہنچایا ہوگا۔ میں نے اس سے یہ سوال اس بنا پر پوچھے تھے کہ وہ دفتر میں بڑے اچھے رتبے پر تھا۔ غالباً ہیڈ کلرک تھا یا آفس سپرنٹنڈنٹ تھا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ اس نے کسی ملازم کی ترقی رکوائی ہوگی یا کسی کو سزا کے طور پر نوکری سے سبکدوش کرایا ہوگا۔

اُس نے پورے وثوق سے کہا کہ اُس کے ہاتھ سے کسی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

میرا دماغ اس لائن پر کام کر رہا تھا کہ یہ جنات کی نہیں کسی دشمن کی کارستانی ہے۔ میرے لئے یہ واقعہ صرف اس لحاظ سے عجیب تھا کہ اس کی تفتیش ہو رہی تھی، ورنہ اس میں میرے لئے حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ سمتھ نے ٹھیک کہا تھا کہ پنجاب کے شمالی علاقوں میں کسی دشمن کو نقصان پہنچانے کے لئے تعویذ اور ٹونے ٹوٹکے حاصل اور استعمال کئے جاتے ہیں۔ آپ نے کئی بار سنا ہوگا کہ فلاں کے گھر سے دبے ہوئے تعویذ نکلے ہیں۔ یہ تعویذ کسی عامل سے لکھوائے جاتے ہیں۔ وہ جگہ بتاتا ہے کہ دشمن کے گھر کس جگہ یہ تعویذ دبائے جائیں۔

انسپکٹر گرے کے لئے یہ واقعہ نیا تھا۔ وہ ڈرنے کی بجائے

لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا مجھے یقین ہے کہ یہ دشمنی کی بنا پر ہو رہا ہے؟ — میں نے اُسے بتایا تھا کہ مذہب اور جنات کو ذہن سے نکال دے۔ وہ بڑا ذہین پولیس آفیسر تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اگر یہ دشمنی کا مظاہرہ ہے تو ہمیں سب سے پہلے اس دشمنی کی وجہ معلوم کرنی ہے۔ دشمن کی نشاندہی ہو گی تو ہم یہ عمل کرنے والے تک پہنچ سکتے ہیں۔

میں دشمنی کی ہی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ناصر علی وثوق سے کہہ رہا تھا کہ اُس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ برادری میں کسی کے ساتھ جائیداد کا جھگڑا بھی نہیں۔ میں نے دشمنی کی دوسری وجوہات معلوم کرنے کے لئے اُس سے پوچھا کہ اُس کی اولاد کیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ تین بیٹے ہیں۔ ایک کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ دوسرے کی پندرہ سولہ سال اور تیسرا دس گیارہ سال کا تھا۔ بیٹی کوئی نہیں تھی۔ اس سے مجھے مایوسی ہوئی۔ دیہات میں اگر کسی کو لڑکی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا جائے تو وہ اسے اپنی توہین سمجھتا ہے۔ بعض لوگ انتقامی کارروائی پر اُتر آتے ہیں — ناصر علی کی کوئی بیٹی نہیں تھی اس لئے دشمنی کی یہ وجہ بھی نہیں تھی۔

میرا دھیان اُس کے بیٹوں پر گیا۔ ہم جب چھت پر گئے تھے تو یہ تینوں اپنے باپ کے ساتھ تھے۔ تینوں خوبصورت تھے۔ رنگ میں کشش تھی اور نقش و نگار میں بھی۔ سب سے بڑا بیٹا خوبصورت جوان

تھا۔ اس کے متعلق ناصر علی نے بتایا کہ ایف۔ اے۔ پاس کرا کے اسے ڈی۔ سی آفس میں سٹینو گرافر لگوا دیا ہے۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟" — میں نے ناصر علی سے پوچھا — "آپ کے ساتھ یہ واردات کوئی دشمن کر رہا ہے یا آپ اسے جنات کی کارروائی سمجھتے ہیں؟"

"میں صاف قسم کا مسلمان ہوں" — اُس نے جواب دیا — "اگر میں اسے جنات کی کارروائی سمجھتا تو میں ڈی۔ سی صاحب پر زور نہ دیتا کہ وہ اس کی تفتیش کرائیں۔ میں جنات کے وجود کا قائل ہوں یا نہیں، اسے مجھ تک رہنے دیں، میں اس کا بالکل قائل نہیں کہ جنات کسی کو یوں پریشان کرتے ہیں۔ یہ کسی کی شرارت ہے"

"آپ اس کے بھی قائل ہوں گے کہ اس قسم کی شرارت کا توڑ بھی ہو سکتا ہے"

"جی ہاں!" — ناصر علی نے جواب دیا — "میں دوستوں کے مشورے سے تین ایسے آدمیوں کے پاس جا چکا ہوں جن کے متعلق مشہور ہے کہ کالے علم کا توڑ کر سکتے ہیں مگر انہوں نے مجھے مایوس کیا۔ یہ تینوں باری باری میرے گھر آئے۔ کچھ پڑھتے رہے اور ادھر اُدھر پھونکیں مارتے رہے۔ ان میں صرف ایک ہے جس نے کہا کہ یہ کسی دشمن کی شرارت ہے۔ اُس نے دو تعویذ لکھ کر کپڑے میں لپیٹے اور باہر والے دروازے کے ساتھ لٹکا دیئے۔ اس کا کچھ اثر نہ ہوا، بلکہ اس کے بعد کپڑوں کو آگ

لگنے لگی۔ دوسرے دونوں نے کہا کہ میرے کنبے کے کسی فرد نے کسی جن کو تکلیف پہنچائی ہے۔"

گرے نے مجھے کہا کہ ہم ان تینوں سے ملیں گے۔ ہم نے ناصر علی سے تینوں کے ٹھکانے معلوم کر لئے۔ میں نے ناصر علی کے متعلق یہ رائے قائم کی کہ روشن خیال اور مومن قسم کا آدمی ہے۔ لوگوں نے اُسے بہت ڈرایا تھا کہ وہ پولیس کو درمیان میں نہ لاتے ورنہ اُسے اور زیادہ نقصان ہوگا۔ اُس نے گھر میں ختم قرآن بھی کیا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ قرآن پاک سے بڑھ کر اور کوئی تعویذ نہیں۔ اس کا اثر ہوگا۔ شاید یہ ختم قرآن کا ہی اثر ہے کہ یہ کیس پولیس کے عام دستور کے خلاف مجھے اور انسپکٹر گرے کو دیا گیا ہے اور ڈی سی اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔

"آپ ذہن پر زور دیں اور ہمیں ذرا سی روشنی دکھا دیں"—— میں نے کہا —— "اگر دشمنی نہیں تو اسے آپ کسی کی شرارت کہتے ہیں۔ کیا آپ اس سوال کا جواب سوچ سکتے ہیں کہ شرارت کے لئے آپ کے گھر کو کیوں منتخب کیا گیا ہے؟"

"میں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا"—— اُس نے کہا۔

"میں آپ کی بیوی سے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں"—— میں نے کہا—— "بعض باتیں صرف عورتیں جانتی ہیں۔ آپ انہیں ہمارے پاس بھیج دیں لیکن آپ اس کمرے میں نہ رہیں۔"

ایسا حُسن بہت کم عورتوں میں دیکھا ہے

اُس نے بیوی کو ہمارے پاس بھیج دیا۔ میں اس پردہ نشین عورت کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایسا حُسن میں نے بہت کم عورتوں میں دیکھا ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ عورت تین لڑکوں کی ماں ہے جن میں سے ایک کی عمر بیس سال ہے۔ میں نے مجبور ہو کر اُس کی عمر پوچھی۔ اُس نے ذرا سوچ کر عمر اڑتیس سال بتائی۔ میری نظر میں وہ تیس سال سے زیادہ کی نہیں تھی۔ میں نے اُس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ مثلاً وہ کہاں کی رہنے والی ہے۔ شادی کب ہوئی تھی۔ اُس کے خاوند کی تعریفیں کیں اور کہا کہ مجھے یقین ہے کہ وہ جتنے خوبصورت ہیں اتنے ہی ذہین ہوں گے۔

میں دراصل یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ عورت کیسی ہے اور اس کے خیالات اور عقیدے کیسے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ پردہ نشین عورت ہے، پولیس سے جھینپے گی اور بات کرتے شرمائے گی، لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ وہ سوال کا جواب فوراً دیتی تھی اور نہ صرف یہ کہ مکمل جواب دیتی بلکہ پوری وضاحت کرتی اور ایک آدھ بات فالتو بھی کہہ جاتی تھی۔

اکثر گھروں میں دیکھا گیا ہے کہ وہاں عورت حکومت کرتی ہے۔

خاوند روزی کمانے اور باہر کے کاموں میں لگے رہتے ہیں اور بیویاں گھر کے کام کاج، محلے اور برادری کی سیاست کو سنبھالے رکھتی ہیں۔ ایسے گھرانوں کی بعض دشمنیوں اور دوستیوں کا خاوندوں کو علم ہی نہیں ہوتا۔ اچھی بیویاں اپنے خاوندوں کو اس فالتو جھک جھک سے بچائے رکھتی ہیں۔ ناصر علی کے ہاں مجھے یہی نظر آ رہا تھا۔ یہ خوبصورت عورت بجائے خود دشمنی کا باعث ہو سکتی تھی۔

مجھے اچانک خیال آ گیا کہ یہ لوگ اس مکان میں کرائے پر رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کا مکان کے مالک کے ساتھ جھگڑا ہوا ور ناصر علی ڈی سی کے دفتر کی افسری کے رعب میں مالک مکان کو خاطر میں نہ لاتا ہو۔ میں نے اُس کی بیوی سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ انہوں نے ایک بار مکان تبدیل کرنے کا ارادہ کیا تھا تو مالکِ مکان نے منت سماجت کر کے روک لیا تھا۔

اُس زمانے میں مکانوں کی نہیں کرایہ داروں کی قلت ہوتی تھی۔ شہروں میں جگہ جگہ "کرائے کے لئے خالی ہے" کے بورڈ اور تختیاں نظر آتی تھیں۔ مالک مکان اور کرائے دار کے لڑائی جھگڑے اب کچھ عرصے سے شروع ہوتے ہیں۔ کوئی کرایہ دار مکان خالی نہ کرے تو مالک مکان کے بیٹے یا کرائے کے غنڈے رات کو کرایہ دار کے گھر پتھر پھینکتے ہیں اور خود ہی یہ افواہ پھیلا دیتے ہیں کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے یا یہ سنگباری جن بھوت کر رہے ہیں۔ مکان خالی کرانے کا یہ طریقہ تہذیب جدید

کی ایجاد ہے۔ ہمارے وقتوں میں مکانوں کے مالک خدا کا شکر ادا کیا کرتے تھے کہ کرایہ دار مل گیا ہے۔

میں اپنے خاوند کی بات مانتی ہوں

دشمنی کی اس وجہ پر بھی ہم نے لکیر پھیر دی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ ہم سے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کرے، ورنہ اُس کا گھر سنگباری اور آتش زنی سے تباہ ہوتا رہے گا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کی کسی کے ساتھ محلے میں یا گاؤں کی برادری میں کوئی دشمنی ہے؟

"دشمن سجن تو ہر کسی کے ساتھ لگے ہوتے ہیں" —— اُس نے جواب دیا —— "ایسی سخت دشمنی کسی کے ساتھ نہیں کہ وہ ہمیں اس طرح نقصان پہنچائے۔"

"ایسی دشمنیاں عموماً رشتوں کے لین دین اور انکار پر ہُوا کرتی ہیں" —— میں نے کہا —— "آپ کی کوئی بیٹی نہیں۔ آپ کی کوئی چھوٹی بہن ہو گی جس کے رشتے سے آپ نے کسی کو مایوس کیا ہو گا۔"

"میری چھوٹی بہن ہے ہی نہیں" —— اُس نے جواب دیا۔

"کیا آپ اپنے خاوند کی طرح یہ تسلیم کرتی ہیں کہ آپ کے گھر میں یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ کالے علم کے ذریعے کروایا جا رہا ہے؟" —— میں نے پوچھا —— "یا آپ اسے جنات کی انتقامی کارروائی سمجھتی ہیں؟"

"میں اپنے خاوند کی بات مانتی ہوں" — اُس نے جواب دیا — "محلے کی عورتیں دو باتیں کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ شر شرار ہے اور وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ یہ کسی دشمن کی کارروائی ہے جو اُلٹے تعویذوں اور ٹونوں کے ذریعے کی جاتی ہے۔ میں اپنے خدا کو اور اُس کے پاک کلام کو مانتی ہوں۔ صبح وشام قرانِ پاک کی تلاوت کرتی ہوں۔"

انگریز انسپکٹر اُردو بڑی اچھی طرح سمجھ اور بول سکتا تھا۔ ہندوستان کے رسم ورواج کو بھی سمجھتا تھا لیکن وہ ہماری چار دیواری کی دُنیا کی سیاست کو نہیں سمجھتا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا سُن رہا تھا اور کاغذ پر پنسل سے کچھ نوٹ کر لیتا تھا۔ مجھے ناصر علی کے بڑے بیٹے کا خیال آیا۔ وہ خوبصورت جوان تھا۔ باپ بیٹا ڈی۔سی آفس جیسے بڑے دفتر میں ملازم تھے۔ گاؤں میں زمین اور حویلی بھی تھی۔ لڑکا بالائی آمدنی بھی کما سکتا تھا۔ اسے تو بیٹیوں والے بیٹیاں پیش کرتے ہوں گے۔ بہرحال میں اندھیرے میں ٹٹول رہا تھا۔ اس لڑکے سے امید کی ایک کرن نظر آتی۔

"آپ نے بیٹے کی شادی کر دی ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "ابھی تو منگنی بھی نہیں ہوئی۔"

"کیوں؟ .... کوئی لڑکی پسند نہیں آرہی ہے؟"

"رشتوں کی کمی نہیں" — اُس نے مُسکرا کر جواب دیا — "مسئلہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ جو گھر لڑکے کو پسند ہے وہ ہمیں پسند نہیں اور ہماری پسند کو وہ قبول نہیں کرتا۔"

"لڑکے کی پسند کے لوگ یہیں رہتے ہیں؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "ہماری برادری کے ہیں۔ ہماری جگہ کے رہنے والے ہیں۔"

"آپ کو جو گھرانہ پسند ہے، اس کے ساتھ رشتے کی بات ہوئی ہے؟"

"لڑکی کی ماں کے ساتھ میری بات ہوئی تھی" — اُس نے جواب دیا — "وہ تو بے چاری منتیں کرتی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اپنے لڑکے کے دماغ سے وہ چڑیلیں نکال لوں۔"

"کونسی چڑیلیں؟" — میں نے چونک کر اس سے پوچھا۔

"جن سے وہ رشتہ جوڑ رہا ہے" — اُس نے جواب دیا۔

"آپ پوری بات سنائیں" — میں نے کہا — "آپ یہ نہ سوچیں کہ اس کا آپ کے گھر میں پتھر پڑنے اور کپڑے جلنے کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ آپ ہمارے ساتھ جو بھی بات کریں گی اس میں آپ کا فائدہ ہے۔"

اُس نے مجھے نظر بھر کر دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اُسے شاید کچھ یاد آگیا تھا۔ میں نے اُسے یاد دلایا — "آپ نے چڑیلیں کیوں کہا ہے؟ وہ کون ہیں؟"

"میرا بیٹا جس لڑکی کو پسند کرتا ہے اُس کی ماں بہت چالاک ہے" — اُس نے کہا — "میری عمر کی ہے اور رنگ روغن اور چہرے مہرے کی خوبصورت ہے۔ اُس کی اصل خوبصورتی یہ ہے کہ اُس کی آنکھیں بھی مسکراتی ہیں اور جس مرد کے ساتھ بات کرتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ عورت

اُس پر مرمٹی ہے۔ دشمنوں کا بھی دل موہ لیتی ہے۔ ہمارے شہر (جو چھوٹا سا قصبہ تھا) کی رہنے والی ہے۔ اب بھی اُس نے پیسے والے ایک آدمی کو پھانس رکھا ہے اور اُس سے خوب کھاتی پیتی ہے۔ پر وہ نہیں کرتی۔ اُس کے دو بیٹے ہیں۔ ان سے بڑی لڑکی ہے جو میرے بیٹے سے ایک آدھ سال چھوٹی ہے۔ ماں کی طرح خوبصورت ہے بلکہ اس سے زیادہ۔"

"آپ سے بھی زیادہ؟" — میں نے کہا۔

اُس نے سر جھکا لیا، پھر آہستہ آہستہ سر اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایسا تاثر تھا جیسے اُسے میری بات پسند نہ آئی ہو۔

"میں نے کبھی بھی نہیں سوچا کہ میں کیسی ہوں" — اُس نے دبی دبی مگر سخت آواز میں کہا — "صرف یہ خیال رکھا کرتی ہوں کہ میں نیت اور اخلاق کی بُری تو نہیں؟ میرا خاوند بہت نیک آدمی ہے۔ میں اُس سے زیادہ نیک بننے کی کوشش کرتی ہوں۔"

انسپکٹر گرے نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُسے دیکھا۔ میں نے اس عورت کے کردار کی تعریف کی اور یہ تعریف میرے دل سے نکلی تھی۔ اُس کے اس ردِ عمل کے بعد میری نظر میں اس عورت کا حُسن دُگنا ہو گیا۔ میں نے کہا — "میں نے صرف یہ معلوم کرنے کے لئے یہ بات کہہ دی تھی کہ میں آپ کے اور اُس عورت کے کردار میں فرق معلوم کرنا چاہتا تھا.... اور محترم خاتون! میں جو کچھ بھی معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں

وہ صرف آپ کے فائدے کے لئے ہے۔ میں آپ سے کوئی آپ کی ذاتی بات پوچھتا ہوں تو وہ بھی صرف اس لئے کہ آپ کی نجات کا راستہ مل جائے۔ میری کسی بات کو غلط نہ سمجھنا۔"

"کردار اور نیت کو اللہ بہتر جانتا ہے" — اُس نے کہا — "میں جو جانتی ہوں وہ آپ کو بتا رہی ہوں۔ میرا بیٹا گاؤں جاتا رہتا ہے۔ مجھے پتہ چلا کہ یہ اُن کے گھر جاتا ہے اور ماں بیٹی نے اس پر اپنا جادو چلا لیا ہے۔ میرا بیٹا دونوں کی تعریفیں کرتا ہے۔ ابھی بچہ ہے۔ اچھے بُرے کو نہیں سمجھتا۔ لڑکی کی ماں ہنسی مذاق کی باتیں زیادہ کرتی ہے۔ چاہے تو مظلوم بن کر اپنے آنسو نکال لیتی ہے، چاہے تو دوسرے کو مظلومیت کا احساس دلا کر اُس کے ساتھ ہمدردی کرتی اور اُس کے دل پر قبضہ کر لیتی ہے۔ میں یہ مان لیتی ہوں کہ اُس کی بیٹی میرے بیٹے کو دل سے سچی نیت سے چاہتی ہوگی مگر میں جانتی ہوں کہ وہ میرے بیٹے پر قبضہ کر لیں گی اور معلوم نہیں اور کیا کچھ کریں گی۔"

"ظاہر ہے کہ آپ نے اُس سے اُس کی بیٹی کا رشتہ مانگا ہی نہیں ہوگا" — میں نے کہا — "کیا اُس نے کبھی اشارہ دیا ہے کہ آپ اُس کی بیٹی کا رشتہ قبول کر لیں؟"

"کئی بار" — ناصر علی کی بیوی نے جواب دیا — "وہ دو تین عورتوں کی زبانی مجھے پیغام بھجوا چکی ہے اور میں صاف جواب دے چکی ہوں۔ اب میں اپنے گھر گئی تھی۔ وہ مجھے ملی اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُس

نے خود میرے ساتھ بات کی، حالانکہ بیٹیوں والے خود بیٹوں والوں کے ہاں نہیں جایا کرتے۔ میں نے اُسے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں اُس کی بیٹی کا رشتہ قبول نہیں کروں گی۔ وہ مجھ پر اپنا جادو چلانے کی کوشش کرنے لگی۔ اُس نے اپنے آنسو بھی نکالے اور کہنے لگی کہ میرا خاوند تم جانتی ہو کہ اللہ کی گائے ہے۔ وہ گھر میں ہو تو بھی پتہ چلتا ہے جیسے گھر میں نہیں ہے ....

"میرے مُنہ سے نکل گیا ۔۔۔ 'تم جو گھر میں ہوتی ہو۔ تم نے گھر میں اُس بے چارے کی حیثیت ہی کیا رہنے دی ہے'۔۔۔ وہ تو مجھ پر برس پڑی۔ میں پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ اُس نے میرے بیٹے کو گمراہ کر دیا تھا۔ لڑکا شادی سے پہلے ہی ہمارے ہاتھ سے نکلتا جا رہا تھا۔ میرے مُنہ میں جو آیا اس عورت سے کہہ ڈالا اور یہ بھی کہا کہ میرا بیٹا تم ماں بیٹی کو نہیں ملے گا۔ وہ مُنہ پر ہاتھ پھیر کر بولی ۔۔۔ 'پھر تیرے گھر میں کوئی اور لڑکی بھی نہیں بسے گی'۔۔۔ دوسرے ہی روز دو عورتوں نے مجھے گھر آ کر بتایا کہ لڑکی کی ماں سخت غصّے میں ہے اور وہ کہتی ہے کہ اُس نے میری لڑکی کو ٹھکرا کر میری جو بے عزّتی کی ہے، اس کا میں انتقام لوں گی اور انتقام ایسا لوں گی کہ اس کا جینا حرام کر دوں گی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" ۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"اسی مہینے کی بات ہے" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "میں وہاں سے واپس آئی تو چار پانچ روز بعد میرے گھر میں پہلا پتھر گرا۔ ہم سمجھے

کہ کسی بچّے نے پھینکا ہو گا مگر یہ سلسلہ ایسا چلا کہ ہم تو مکان بدلنے کی سوچ رہے ہیں۔"

"اگر آپ اس عورت کو اچھی طرح جانتی ہیں تو آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ مزاروں اور پیروں فقیروں کے ہاں بھی جاتی ہو گی" ۔۔۔ میں نے کہا۔

"بہت زیادہ" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"ان میں کوئی ایسا پیر یا عامل بھی ہے جو اُسے تعویذ دیتا ہو؟"

اُس نے مجھے دو نام بتائے اور کہا کہ یہ دونوں جنّ حاضر کرنے اور نکالنے میں مشہور ہیں۔ ان کے پاس زیادہ تر وہ عورتیں جاتی ہیں جن کے بیٹے اُن کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں یا جن کی ساسیں بہت بُری ہوتی ہیں یا جن کی بہوئیں اُن کے بیٹوں کو ماں باپ سے الگ کر لیتی ہیں یا ایسے مریض جن کے مرض لاعلاج ہوتے ہیں۔

"کیا آپ کے خاوند کو معلوم ہے کہ اس عورت نے آپ کو انتقام کی دھمکی دی تھی؟"

"میں نے انہیں بتایا تھا" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "انہوں نے کہا تھا کہ ایسی بدچلن عورتیں ایسی ہی دھمکیاں دیا کرتی ہیں۔ تم اپنے بیٹے کو اپنے قابو میں رکھو .... میں نے انہیں کہا تھا کہ میں اب گھر جاؤں گی تو ایک تعویذ لکھوا کر بیٹے کو پلاؤں گی۔ میرے خاوند نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ تعویذوں سے کسی کے خیالات اور خواہشات کو نہیں بدلا جا سکتا۔"

میں نے اُس کے خاوند کو بلا لیا اور اُس سے اس عورت اور اُس کی دھمکی کے متعلق پوچھا اور کہا کہ اُس نے اتنی اہم بات مجھے پہلے کیوں نہ بتائی۔ اُس نے جواب دیا کہ وہ تعویذوں اور ٹونوں ٹوٹکوں کو مانتا ہی نہیں۔ اُس لیے اس عورت کی دھمکی پر دھیان دیا ہی نہیں۔ میں نے اس سے پوچھا، کیا یہ عورت اس حد تک پہنچ سکتی ہے کہ آپ کے خلاف اُلٹے تعویذ استعمال کرے؟ اُس نے جواب دیا کہ اُس کی کوئی حد نہیں۔ بہت چالاک اور خطرناک عورت ہے۔

انسپکٹر گرے نے مجھے کہا کہ ہمیں فوری طور پر اس عورت کے متعلق معلوم کرنا چاہیئے کہ اُس نے ان لوگوں کو نقصان پہنچانے اور پریشان کرنے کے لیے کسی سے تعویذ لیے ہیں؟ اگر لیے ہیں تو وہ کون ہے؟ اُس نے یہ بھی کہا کہ ہم یہاں کے ایس۔ ایچ۔ او سے ابھی تک نہیں ملے۔ اُس سے پوچھنا ضروری ہے کہ اُس نے کیا کارروائی کی تھی اور اسے تفتیش سے کچھ حاصل ہوا تھا یا نہیں۔

تھانیدار بھی ڈر کر بیٹھ گیا

ہم تھانے گئے تو ایس۔ ایچ۔ او ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُسے اطلاع مل چکی تھی کہ ہم آ گئے ہیں اور موقعۂ واردات پر ہیں۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ ہم نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے تفتیش کہاں تک پہنچائی ہے۔

اُس نے کہا کہ وہ ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس کی وجوہات اُس نے یہ بتائیں کہ اُسے شہر کے ہندوؤں نے کہا تھا کہ یہ مسلمانوں کے مذہب کا معاملہ ہے، اس میں دخل نہ دینا۔ بعض مسلمانوں نے (جن میں تھانے کے مسلمان ملازم خاص طور پر شامل تھے) اُسے ڈرایا تھا کہ یہ کوئی شر شرار ہے یا اس مکان میں جنوں کا خاندان آباد ہو گیا ہے۔ یہ خاندان ان لوگوں کو مکان سے نکالنا چاہتا ہے۔

اس ہندو تھانیدار نے اعتراف کیا کہ اُس نے ڈر کے مارے تفتیش میں دلچسپی نہیں لی۔ اُسے یقین تھا کہ اس واردات کا ملزم کوئی انسان نہیں۔ انسپکٹر گرے نے اُس سے پوچھا کہ اُس کے مخبروں نے اُسے کوئی خبر یا کوئی سراغ دیا تھا؟ — اُس نے کہا کہ مخبر جواب دے گئے تھے۔ وہ سب جنوں اور شر شرار سے ڈرتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا تھا کہ ناصر علی نیک اور عبادت گزار آدمی ہے۔ وہ شاید کوئی چلّہ یا کوئی وظیفہ کر رہا تھا جو کسی بدپرہیزی کی وجہ سے اُلٹا ہو گیا ہے۔

ہم نے تھانیدار کی مجبوری اور وضاحت کو قبول کر لیا۔ سورج غروب ہو گیا تھا۔ میں نے تھانیدار کو اُن تینوں عاملوں وغیرہ کے ٹھکانے بتائے جن کے پاس ناصر علی یہ معلوم کرنے گیا تھا کہ اُس کے گھر پر یہ پُراسرار آفت کس طرح نازل ہوتی ہے اور اس کا توڑ کیا ہے۔ میں نے تھانیدار سے کہا کہ صبح سورج نکلے تو یہ تینوں تھانے میں موجود

ہوں۔ تھانیدار کچھ ہچکچایا۔ میں نے اُسے کہا کہ ان لوگوں کا مذہب کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ انہیں یہ کہنا کہ ایک مسلمان تھانیدار آیا ہے اور وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔ اُس نے مشورے کے لئے بلایا ہے۔ انہیں یہ پتہ نہ چلے کہ تفتیش کے لئے بلایا ہے۔

ہم کھانے اور آرام کے لئے ریسٹ ہاؤس میں چلے گئے۔ بہت دیر اس واردات پر بحث اور غور کرتے رہے۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ تعویذوں کا اثر ہے یا جادو کا، یہ اُس عورت نے کروایا ہے جس کی بیٹی کو ناصر علی کی بیوی نے دُھتکار دیا تھا۔ ہم نے اُسے جال میں لانے اور متعلقہ عامل کو پکڑنے کے طریقے سوچے اور سو گئے۔

صبح تھانے گئے تو تین آدمی بیٹھے تھے۔ انہیں اکیلے اکیلے اندر بٹھا کر پوچھا۔ آدھا دن انہی کے ساتھ گزر گیا۔ یہ پوچھ گچھ بہت طویل تھی۔ تینوں نے کہا کہ یہ شر شرار کی کارستانی بھی ہو سکتی ہے اور کالے علم کا اثر بھی۔ میں نے اور انسپکٹر ٹاگرے نے ان میں سے ہر ایک سے یہ جاننے کی بہت کوشش کی کہ وہ بھی کالا علم جانتے ہیں یا اُلٹے تعویذ لکھتے ہیں؟ تینوں نے "توبہ توبہ" کہہ کر انکار کیا۔ ان میں سے ایک دوسرے کے متعلق بھی پوچھا۔ کسی نے کسی کی نشاندہی نہ کی۔

ان سے یہ بھی پوچھا کہ وہ اِرد گرد کے علاقے میں کسی ایسے عامل کو جانتے ہیں جو کالا علم جانتا ہو؟ — انہوں نے بتایا کہ جنات اور شر شرارہ سے نجات دلانے والے عامل تو ہیں، کالے علم والا کوئی نہیں۔ میں نے

ناصر علی کے آبائی قصبے کا نام لے کر پوچھا کہ وہاں کوئی ہے؟ — انہیں معلوم نہیں تھا۔

"دیکھئے صاحب!" — ایک نے کہا — "کالا علم اور اُلٹے تعویذوں کا علم جاننا کوئی مشکل نہیں۔ انہیں استعمال کرنے کے لئے بڑے مضبوط دِل گُردے کی ضرورت ہے۔ یہ علم کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اس لئے یہ گُناہ ہے۔ اس کا اثر اُس پر بھی ہو سکتا ہے جو یہ علم استعمال کرتا ہے۔ گناہ کا اثر گناہگار پر بھی ہوتا ہے، اس لئے عامل کالا علم جاننے کے باوجود اسے بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ اگر کوئی عامل کسی کو اُلٹا تعویذ دے بھی دے تو اسے وہ راز میں رکھتا ہے۔ یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ تعویذ کس نے لکھوایا یا یہ جادو کس نے چلایا ہے۔"

"اس کی فیس عام طور پر کتنی ہوتی ہے؟"

"بہت زیادہ" — مجھے جواب ملا — "عام لوگ اتنی قیمت دے ہی نہیں سکتے۔ میں آپ کو راز کی ایک بات بتاتا ہوں۔ اگر کالا علم کسی کے خلاف استعمال کرنے والی عورت ہو اور وہ خوبصورت اور جوان ہو تو عامل اُس کا کام کر دیتا ہے۔ یہ عورت بھی فیس میں شامل ہوتی ہے۔ آپ اگر غور سے دیکھیں تو آپ کو کسی کے خلاف اُلٹے تعویذ کروانے والی صرف عورتیں ملیں گی۔"

ہم نے اِن تینوں کو ٹھونک بجا کر دیکھ لیا۔ ہم دونوں نے بہت

جرح کی مگر کچھ حاصل نہ ہُوا۔ ہم نے انہیں اکٹھے بٹھا کر پوچھا کہ وہ اس واردات کا توڑ نہیں کر سکتے جو ناصر علی کے گھر میں ہو رہی ہے؟ تینوں نے مختلف طریقے بتائے۔ ان میں سے دو اسے جنات کی انتقامی کارروائی کہتے رہے۔ انہیں ہم نے رخصت کر دیا اور ناصر علی کے آبائی قصبے کے تھانے میں جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ہمیں لڑکی کی ماں کو جال میں لینا تھا۔

بیٹی ماں کی طرح شوخ

ہم نے بذریعہ ٹیلیفون وہاں کے تھانیدار کو اطلاع دی اور ڈیڑھ گھنٹے بعد وہاں پہنچ گئے۔ ایس۔ ایچ۔ او سکھ تھا۔ اسے واردات کی تفصیل بتائی۔ اسے لڑکی کے باپ کا نام بتایا اور کہا کہ اپنے مخبروں کو بلاؤ یا اُن کے ٹھکانوں پہ جاؤ اور ہمیں دو سوالوں کا جواب دو۔ ایک یہ کہ یہ گھرانہ کیسا ہے اور اس کی شہرت کیسی ہے؟ دوسرے یہ کہ یہاں اُلٹے تعویذ لکھنے والا کون ہے؟ یہ سکھ (سب انسپکٹر) چرن سنگھ سندھو تجربہ کار تھانیدار تھا۔ وہ سکھوں کے ایسے علاقوں میں رہ چکا تھا جہاں چوبیس گھنٹوں میں بارہ وارداتیں ہُوا کرتی تھیں۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ہم چرن سنگھ کی انگلی پکڑ کر اس سے تعاون حاصل کرتے اور اسے الف بے پڑھاتے۔ ہم نے اسے واردات کی تفصیل اور اپنے شکوک

بتا دیتے۔ اُسے معلوم تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ ہم اُسے ٹیلیفون پر بتا دیتے تو بھی وہ یہ کام کر دیتا لیکن ہم نے اُس پر بھروسہ نہ کیا۔ وہ مشتبہ افراد کے ساتھ ساز باز کر سکتا تھا۔ ہم نے اُس کے سر پر رہنا ضروری سمجھا۔

ہم نے ناصر علی کی بیوی کے متعلق بھی تھانیدار سے کہا کہ معلومات فراہم کرے۔

چھوٹے سے قصبے میں ہر کوئی ہر کسی کو جانتا تھا۔ مخبروں کے لئے کسی گھر کے حالات معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مخبروں کے متعلق آپ کو شاید پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ لوگ پولیس کی آنکھیں اور کان ہوتے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں ان میں بعض مستقل تنخواہ پہ تھے اور زیادہ تر کام کے مطابق اُجرت پہ۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ یہ لوگ کم درجے کے اور گھٹیا سی قسم کے افراد ہوں گے جو تھانے میں جا کر چغلیاں کرتے ہوں گے۔ آپ کا خیال کسی حد تک صحیح ہے۔ اس پیشے میں جرائم پیشہ افراد بھی تھے اور اس میں معزز افراد بھی شامل تھے جن پہ کسی کو شک نہیں ہوتا تھا کہ یہ مُخبری کرتے ہوں گے۔ ان لوگوں سے ہم معزز گھرانوں کے اندر کے حالات معلوم کیا کرتے تھے۔ نمبردار، ذیلدار، سفید پوش اور چوکیدار ہمارے سرکاری مُخبر ہُوا کرتے تھے۔ ایوب خان مرحوم کے دورِ حکومت کے بی۔ ڈی ممبر پولیس کے بہترین اور قابلِ اعتماد مُخبر ثابت ہُوتے تھے۔

ہم نے ایسے دو معزز مخبروں کو اپنی ہدایات دیں۔ دونوں مسلمان تھے۔ انہوں نے لڑکی اور اُس کی ماں کے متعلق وہی رپورٹ دی جو ناصر علی کی بیوی سے ہم سُن چکے تھے۔ اس سے ہمیں اطمینان ہُوا کہ ناصر علی کی بیوی نے جھوٹ نہیں بولا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ مشہور عورت ہے۔ مردوں کو انگلیوں پر نچاتی ہے مگر کسی کے ہاتھ کم ہی آتی ہے۔ اُس کی ان حرکتوں کا نتیجہ ہے کہ کوئی شریف اور باعزت گھرانہ اُس کی بیٹی کا رشتہ قبول نہیں کرتا۔

"لڑکی کا چال چلن کیسا ہے؟"

"ماں کی طرح شوخ اور ہنس مُکھ ہے لیکن اسے ابھی بدکار نہیں کہا جاسکتا" — ایک نے جواب دیا — "ہماری عورتیں بتاتی ہیں کہ لڑکی کی شادی جلدی نہ ہُوئی تو ماں اسے خراب کر دے گی۔ ماں نے لڑکی کو بہت استعمال کیا ہے کہ کوئی لڑکا اسے اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف قبول کرلے لیکن برادری میں اسے کوئی قبول نہیں کرتا۔"

"ناصر علی نے بھی قبول نہیں کیا؟" — میں نے پوچھا — "اُس کا بڑا لڑکا تو اُن کے جال میں آیا ہُوا ہے۔"

دونوں معزز مخبروں نے مجھے چونک کر دیکھا۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ میں پہلے ہی بہت کچھ جانتا ہوں۔ ان کی حیرت کو دیکھ کر میں نے کہا — "ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔ جہاں ہیرا پھیری کرو گے، میں تمہاری گردن پکڑ لوں گا۔ پھر تم جانتے ہو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔"

"جی ہاں" — ایک نے کہا — "یہ درست ہے کہ ناصر علی نے اس گھرانے کو قبول نہیں کیا لیکن اُس کا لڑکا اُن کے خوبصورت جال میں ایسا پھنسا ہے کہ نکلتا نظر نہیں آرہا۔"

انسپکٹر گرے نے ان سے پوچھا — "ناصر علی کے گھر کے متعلق تم لوگ کیا جانتے ہو؟"

"صاحب بہادر!" — ان میں سے ایک نے کہا — "آپ ہم سے پوچھیں کہ ناصر علی کے گھر کے متعلق ہم کیا نہیں جانتے ..... یہاں مسلمانوں کے گھر تھوڑے سے ہیں اور سب ایک ہی محلے میں رہتے ہیں۔ کسی کی کوئی بات کسی سے چھپی نہیں رہتی" — اُس نے "صاحب بہادر" کو خوش کرنے کے لئے کہا — "ہم لوگ بہت جاہل اور جانگلی ہوتے ہیں صاحب بہادر! ہماری عورتیں نہ اپنا پردہ رہنے دیتی ہیں نہ کسی دوسرے کا۔ آپ آدھی دُنیا کے بادشاہ ہیں۔ ہم تو جانور ہیں۔"

صاحب بہادر نے صاحب بہادروں کی طرح کہا — "فالتو بک بک مت کرو۔ ہم نے جو پوچھا ہے، اس کا جواب دو۔"

"ہاں صاحب بہادر!" — اُس نے کہا — "ناصر علی بہت شریف آدمی ہے۔ وہ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے دفتر میں اونچے عہدے پر ہے۔ ہم اسی ضلعے میں آتے ہیں۔ ہمارا کوئی نہ کوئی کام ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے دفتر میں پڑجاتا ہے۔ ہم غریبوں کو وہاں کون پوچھتا ہے۔ ناصر علی ہمارے سارے کام کرا دیتا ہے۔"

"رشوت لیتا ہوگا" — انسپکٹر گرے نے پوچھا۔

دونوں نے پہلے کانوں پر ہاتھ رکھے، پھر گرے کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ دوسرے نے کہا — "ہم سے کوئی سی قسم لے لو صاحب بہادر! ناصر علی اس شہر کے کسی آدمی سے رشوت نہیں لیتا۔ یہاں کا کوئی آدمی اُس کے پاس چلا جاتا ہے تو اُس کا کام بھی کرتا ہے اور اُسے اپنے گھر لے جا کر کھانا بھی کھلاتا ہے۔ ہم لوگ اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔"

"اور اُس کی بیوی کیسی ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"اچھی عورت ہے" — ایک نے جواب دیا۔

"ناصر علی نے اس کا دل اپنے ساتھ لگا لیا تھا" — دوسرے نے جو عمر کے لحاظ سے ناصر علی سے دس بارہ سال بڑا معلوم ہوتا تھا، کہا — "ہمارا خیال تھا کہ یہ لڑکی اس گھر کو خراب کرے گی۔"

میں بدک اُٹھا۔ انسپکٹر گرے بھی چونکا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ پوری بات سنائے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ اس عورت کے خلاف بات کرنے سے گریز کر رہے تھے۔ ایک نے اس کا اظہار کر بھی دیا۔

"ہم اس عورت کو بدنام کرنے سے ڈرتے ہیں" — بڑی عمر کے آدمی نے کہا — "شادی کے بعد اُس نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ نیک عورت ہے اور نیک خاوند کی بیوی ہے۔ اب تو ہم کہا کرتے ہیں کہ یہ عورت جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی نیک، ملنسار اور ہر کسی کے دُکھ میں شریک

ہونے والی عورت ہے۔ شادی سے پہلے کی بات ہے کہ برادری کا ایک لڑکا اسے ایسا پسند آیا کہ اُس نے ہیر رانجھے اور سوہنی مہینوال کی یاد تازہ کر دی۔ لڑکا بھی کھاتے پیتے گھرانے کا تھا۔ وہ تو لڑکی کا نام لیتا تو انگلیاں ہونٹوں اور آنکھوں کو لگاتا تھا۔ یہ الزام کوئی بھی نہیں لگا سکتا کہ ان کے تعلقات گندے تھے، یہ سب نے دیکھا کہ لڑکی چھتیں اور فصیلیں پھلانگ کر لڑکے سے ملتی تھی۔ لڑکا اسے جہاں بلاتا تھا وہ خطرے مول لے کر وہاں پہنچتی تھی۔ لڑکے نے بھی اس کے لئے بہت خطرے مول لئے۔ دونوں نے اپنے اپنے ماں باپ اور بھائیوں سے مار کھائی مگر اُن کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا....

"آپ جانتے ہیں حضور! ہم لوگ اتنے بے غیرت نہیں کہ لڑکی لڑکے کی پسند کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔ لڑکے کی منگنی کئی سال پہلے کسی اور گھر میں ہو چکی تھی اور لڑکی کے والدین کہتے تھے کہ وہ اس لڑکے کو رشتہ نہیں دیں گے کیونکہ لڑکا آوارہ ہے اور اُس نے اُن کی لڑکی کو خراب کر دیا ہے۔ لڑکے کی شادی اس لڑکی کے ساتھ ہو گئی جس کے ساتھ اس کی منگنی ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی لڑکی اور وہ ملتے رہے۔ ایک سال بعد اس لڑکی کی شادی ناصر علی سے ہو گئی۔ سب کہتے تھے کہ یہ لڑکی ناصر علی جیسے شریف لڑکے کے ساتھ نہیں بسے گی اور وہ اس گھر کو بدنام کرے گی....

"ہم لوگ ایک دوسرے کے بھید لے کر بہت خوش ہوا کرتے ہیں

اور ہم ایک دوسرے کا تماشہ دیکھا کرتے ہیں۔ ہم ناصر علی اور اس کی دلہن کا بھی تماشہ دیکھنے لگے لیکن ہمیں وہ تماشہ نظر نہ آیا جو ہم سب دیکھنا چاہتے تھے۔ لڑکی نے تو جیسے اپنے چاہنے والے کو دل سے ہی اُتار دیا تھا۔ عورتوں نے نظریں انہی پر لگا رکھیں کہ یہ چوری چھپے ملتے ہوں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ ایک عورت تھی جو اُن کے پیغام لاتی لے جاتی تھی۔ عورتیں اس سے پوچھتی تھیں۔ اُس نے قسمیں کھا کر بتایا کہ لڑکی اسے نہیں ملتی۔ البتہ اُس نے یہ بتا دیا کہ لڑکا اُسے بلاتا ہے مگر لڑکی نے اُسے صاف کہہ دیا ہے کہ اُس نے اللہ اور رسولؐ کے کلمے پڑھ کر جس کے ساتھ شادی کی ہے اُسے وہ دھوکہ نہیں دے گی۔ لڑکی نے اُسے یہ بھی کہا کہ ناصر علی نے مجھے زبردستی بیوی نہیں بنایا اور مجھے اغوا بھی نہیں کیا۔ پھر دن گزرتے گئے اور ہم لوگ مان گئے کہ ناصر علی کی بیوی نیک ہے اور اُس نے اپنے میکے اور سسرال کی عزت رکھ لی ہے۔"

"اور اس آدمی کے گھر کا کیا حال رہا؟" — میں نے پوچھا۔

"بہت بُرا" — اُس نے جواب دیا — "اُس نے اپنی بیوی کو چھوڑا بھی نہیں اور اُسے طریقے سلیقے سے بسایا بھی نہیں۔ اُس کے گھر میں لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے اور تین بچے بھی پیدا ہوئے۔ میاں بیوی اپنی اپنی جگہ پریشان اور ناخوش رہے۔"

میں نے اور انسپکٹر گرے نے ان پر جرح کی اور اپنے کام کی چند اور باتیں ان سے معلوم کر لیں۔

دلچسپ اور رومانی باتیں، مگر....

انسپکٹر گرے نے مجھے انگریزی میں کہا — "اس عورت کو بھی ہم مشتبہ فہرست میں شامل کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ کالا علم اور اُلٹے تعویذ زیادہ تر عورتیں کرواتی ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس عورت نے تنگ آ کر ناصر علی کی بیوی کے لئے تعویذوں کے ذریعے مصیبت پیدا کی ہو۔ اُسے شک ہو گا کہ اس کا خاوند اب بھی ناصر علی کی بیوی سے ملتا ہے۔"

انسپکٹر گرے نے بات پتے کی کہی تھی مگر میں نے ان آدمیوں سے پوچھا کہ وہ ابھی تک لڑتے ہیں تو مجھے انہوں نے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ ایک سال گزرا وہ عورت مر گئی ہے۔

"ناصر علی کے ساتھ اس آدمی کے تعلقات کیسے ہیں؟"

"ان میں ناراضگی پیدا نہیں ہوتی" — ایک نے جواب دیا — "ناصر علی جیسا آج ہے ایسا ہی شادی سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ اُس کا باپ بھی ایسا ہی تھا۔ اس خاندان کی آنکھیں بھی روشن ہیں اور دماغ بھی روشن۔ ناصر علی کو بھی معلوم تھا کہ جس لڑکی کے ساتھ اس کی شادی کی جا رہی ہے اُس کا دل کہیں اور ہے۔ اُس نے شادی کی اور اُس کے گھر میں کبھی بدمزگی پیدا نہیں ہوتی۔"

"ہم تعریف ناصر علی کی ہی کریں گے" — دوسرے نے کہا —

"اُس نے اس آدمی کے ساتھ تعلقات بڑے اچھے رکھے جسے اُس کی بیوی چاہتی تھی، حالانکہ ناصر علی اور اس آدمی کے اخلاق میں سفید اور سیاہ جتنا فرق ہے۔ ناصر علی جتنا نیک ہے، وہ آدمی اتنا ہی بد ہے۔"

"کیا بدی کرتا ہے؟" — انسپکٹر گرے نے پوچھا۔

"صاحب بہادر!" — اُس نے کہا — "اُس کا زمیندارہ اچھا ہے اس لئے اُس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں۔ سکھوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب بھی پی لیتا ہے جو ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ بدمعاش عورتوں کے پاس جاتا ہے۔ اس عورت کے ساتھ بھی اُس کا دوستانہ ہے جو اپنی بیٹی ناصر علی کے بیٹے کو دینا چاہتی ہے۔ اس عورت نے اُس سے بہت مال کھایا ہے۔ پھر یہ تکیے پر جوئے کی بازی بھی لگاتا ہے۔"

انسپکٹر گرے نے مجھے کہا — "ان دونوں نے بڑی دلچسپ اور رومانی باتیں سنائی ہیں۔ تم بھی دلچسپی لے رہے ہو۔ میں بھی جرح کئے جا رہا ہوں لیکن تم نے محسوس نہیں کیا کہ ہم وقت ضائع کر رہے ہیں اور ہم اپنی لائن سے ہٹ گئے ہیں؟"

"مجھے کچھ اطمینان ہو رہا ہے جیسے ہم منزل کے قریب آگئے ہیں" — میں نے کہا — "ہمارے ملزم یہیں ہیں۔"

انسپکٹر گرے بہت حد تک میرا ہم خیال تھا۔

"تم دونوں ہر جگہ کی خبر دے سکتے ہو" — میں نے ان معزز مخبروں سے کہا — "ان باتوں کو ایک طرف رکھو جو ہم تم کرتے رہے ہیں۔

میرا ایک کام کرا دو" — دونوں زرخرید غلاموں کی طرح متوجہ ہوتے۔ میں نے کہا — "سنا ہے یہاں کوئی آدمی اُلٹے تعویذ لکھتا ہے اور اُلٹا عمل بھی کرتا ہے۔"

"آپ کو کیا ضرورت پڑ گئی حضور؟" — ایک نے فدویانہ مسکراہٹ سے کہا — "آپ کو اُلٹے علم کی کیا ضرورت ہے؟ قانون آپ کے ہاتھ میں ہے، ہتھکڑیاں آپ کے ہاتھ میں۔ آپ تو کالے علم کے بغیر ہی دشمن کا بھٹہ بٹھا سکتے ہیں۔"

"ہے کوئی ایسا آدمی؟"

"ہے جی" — بڑی عمر والے نے کہا اور اُس نے دوسرے آدمی سے پوچھا — "کیوں چوہدری! گوگل یہ کام نہیں جانتا؟"

"جانتا تو ہے، کرے گا نہیں" — دوسرے نے کہا — "وہ جن حاضر کرتا ہے۔ دو پھونکیں مار کر شر شرار کو دفع کر دیتا ہے مگر اُلٹا تعویذ شاید نہ دے۔ کہتے ہیں کہ یہ کام بہت خطرناک ہوتا ہے۔"

"میں اُسے منہ مانگے پیسے دوں گا" — میں نے کہا۔

"آپ کو شاید دے دے" — بڑی عمر والے نے کہا — "اگر آپ کہیں تو میں اُس سے بات کرتا ہوں" — میں نے گوگل کا ٹھکانہ معلوم کر لیا۔

انسپکٹر گرے نے مجھے انگریزی میں کہا — "لمبا راستہ اختیار نہ کرو۔ اُسے یہاں بلاؤ اور ظاہر کرو کہ تمہیں اس کے علم کی ذاتی ضرورت ہے، پھر اپنا جادو چلاؤ۔ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ میں بھی ساتھ ہوں گا۔ انہی سے کہو کہ اُسے

بلا لائیں۔"

میں نے ان دونوں سے کہا کہ گوگل کو یہاں لے آؤ۔ اُسے کہنا کہ بڑی دُور سے ایک مسلمان تھانیدار تمہاری شہرت سُن کر آیا ہے اور اسے اپنے ذاتی کام کے لئے تمہاری ضرورت ہے۔ اگر وہ نہ آنا چاہے تو میں اُس کے ڈیرے پر آجاؤں گا۔

وہ دونوں جانے کے لئے اُٹھے تو ایک نے مجھے کہا — "حضور! آپ نے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ آپ نے ہم سے یہ باتیں کیوں پوچھی ہیں۔ اگر حضور بتا دیں تو ہم شاید آپ کی مدد کر سکیں۔"

میں نے انہیں ٹال دیا اور کہا کہ اُن کے ساتھ بڑی دلچسپ گپ شپ رہی ہے۔ میں نے ان کی اتنی تعریف کی کہ ان کے چہروں پر رونق آگئی۔ یہ لوگ انگریزوں کو آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق سمجھا کرتے اور پولیس کے افسروں کے آگے بچھ بچھ جایا کرتے تھے۔ آج بھی ان میں سے کسی کے گھر جائیں تو وہ آپ کو سندوں کا ایک پلندہ بڑے فخر سے دکھائے گا۔ یہ عام سے کاغذات ہوں گے جن پر انگریز افسروں نے اس کی "خدمات" کو سراہا ہوگا۔ ان میں بعض سندیں انگریز لیفٹیننٹوں کی لکھی ہوئی ہوں گی۔ ان کی انگریزی تحریر ایک جیسی ہوگی — "میں شکار کھیلنے گیا تو اس آدمی نے میری بہت مدد کی۔ یہ آدمی ہر قسم کے حالات میں قابلِ اعتماد ہے اور انعام کا مستحق" — یہ لوگ انگریزی لکھ پڑھ نہیں سکتے لیکن ہر سند کو پہچانتے ہیں کہ یہ کون سے افسر نے دی تھی اور اس میں کیا لکھا ہے۔

دونوں چلے گئے۔

ان دونوں کی رپورٹ کے بعد ہمیں کسی اور مخبر کی رپورٹ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ البتہ ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ لڑکی کی ماں اس عامل کے پاس جاتی ہے یا نہیں اور اس عامل نے اسے تعویذ وغیرہ دیا تھا یا نہیں۔ مجھے ذاتی طور پر یقین سا ہونے لگا تھا کہ ملزم یہی عامل ہے اور کالا علم کرنے والی یہی عورت ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ انسپکٹر گرے کے کہنے کے مطابق اس پر ہمارا براہِ راست حملہ کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔ میں محتاط ہو کر آہستہ آہستہ دوسروں کے ذریعے اُس حد تک پہنچنا چاہتا تھا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد ہمارے دو معزز مخبروں کے ساتھ ایک آدمی آیا جس کے مُنہ سے دس قدم دُور سے چرس کی بدبو آرہی تھی۔ اُس کے چہرے پر کراہیت سی تھی یا شاید میں اسے حقارت کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سر پر عجیب سے طریقے سے سبز صافہ باندھ رکھا تھا۔ کُرتہ بھی سبز تھا اور شلوار کا رنگ پھیکا پھیکا سا تھا۔ اُس کے دونوں کانوں میں چھوٹی چھوٹی مُندریاں تھیں اور گلے میں جامن کے سائز کے اُن موتیوں کی مالا تھی جو لوگ بھینسوں کے گلوں میں ڈالا کرتے ہیں۔ اُس کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے کوئی وِرد کر رہا ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کا استقبال اس طرح کیا کہ جھک کر اُس کے گھٹنے چھوئے، مصافحہ کیا اور اُس کے ہاتھ چومے۔ اُس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں اُسے اپنے دفتر میں لے گیا۔ انسپکٹر گرے نے دیکھ لیا تھا

کرمیں نے اس کا استقبال کس طرح کیا ہے۔ گرے نے بھی اُٹھ کر ہاتھ ملایا پھر جُھک کر اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔ اس سے عامل کا دماغ یقیناً بے قابو ہو گیا ہو گا۔ میں نے اُسے کُرسی پر بٹھایا۔ ہم دونوں اس کے بیٹھنے کے بعد بیٹھے۔

"حکم جناب!"۔۔۔ اُس نے آنکھیں اَدھ کُھلی کر کے جلالی سے لہجے میں کہا۔۔۔"کیسے یاد فرمایا؟"

"دِلّی سے آپ کی شہرت سُن کر آیا ہوں"۔۔۔ میں نے حاجت مند مریدوں کی طرح التجا کی ۔۔۔"یہ صاحب بہادر پولیس کا افسر ہے۔ یہ بھی کہتا تھا کہ میں اس برگزیدہ شخصیّت کو دیکھوں گا جو گھر بیٹھے ایک پھونک سے دشمنوں کے گھر پھونک ڈالتی ہے میں آپ سے کوئی کام پولیس کے رعب سے نہیں کراؤں گا۔ جو خدمت آپ بتائیں گے کروں گا منہ مانگا نذرانہ پیش کروں گا۔"

"مُراد کیا ہے؟"۔۔۔ اُس نے پُرانے زمانے کے بادشاہوں کی طرح پوچھا۔

"ایک دشمن نے میرا بہت نقصان کیا ہے.... میں اُس کا نقصان ایسے طریقے سے کرنا چاہتا ہوں کہ وہ تباہ ہو جائے"۔۔۔ میں نے کہا۔

میں نے ایک کہانی گھڑ کر اُسے سُنا دی مگر اُس نے میری مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اور زیادہ منّت سماجت کی۔ اُس نے پھر بھی معذوری کا اظہار کیا اور کہنے لگا کہ یہ بہت خطرناک کام ہے۔

اُس نے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ وہ کالا علم جانتا ہے۔

"آپ نے ایک کام حال ہی میں کیا ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "آپ کے پتھر اور شعلے انبالہ کے ایک گھر پر برس رہے ہیں۔ سب مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ آپ کی کرامات ہے۔"

اُس کی آنکھیں جو اَدھ کُھلی تھیں پوری کُھل گئیں اور اُس کا چہرہ صاف بدل گیا۔ میں نے اُسے سنبھلنے نہ دیا۔

"حضور!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔"میں خفیہ پولیس کا افسر ہوں۔ مجھ سے زمین کی تہوں کے راز پوچھ لو۔ بتا دوں گا۔"

"آپ کو کس نے بتایا ہے کہ وہ ہماری کرامت ہے؟"۔۔۔ اس نے بدلے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"جس کے لئے آپ نے یہ کرامت نازل فرمائی ہے"۔۔۔ میں نے جواب دیا اور اُس کے چہرے کو اور زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔۔۔"میں اپنی آنکھوں دیکھ آیا ہوں۔"

وہ بے چین سا ہو گیا۔ گھبرائے ہوئے انداز سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"جناب!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔"آپ میرا کام نہ کریں۔ آپ بادشاہ ہیں مگر اس سے آپ انکار نہیں کر سکتے کہ آپ کے کالے عمل سے انبالہ کے ایک گھر میں پتھر گر رہے ہیں اور کپڑے جل رہے ہیں۔"

اُس نے اب ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جن میں معلوم نہیں

کیسا تاثر تھا۔ دبی سی آواز میں بڑبڑایا — "ہم ہر کسی کے لئے ایسا کام نہیں کر سکتے" — وہ اُٹھ کھڑا ہُوا — "ہم جا رہے ہیں" — وہ چلنے لگا۔

میں نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ اُس نے میرے مُنہ کی طرف دیکھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں خاموش رہا۔ وہ میری نظروں کا سامنا نہ کر سکا۔ کچھ دیر بعد میں نے دھیمی سی آواز میں کہا — "گوگل! میں تمہیں اتنی جلدی نہیں جانے دوں گا۔ تمہارے لئے حوالات کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔"

وہ یوں بدکا جیسے گر پڑے گا۔

"مجھ پہ اپنا جادو چلا کر دیکھو" — میں نے کہا — "جہاں ہتھکڑیاں بجتی ہیں وہاں جادو نہیں چلا کرتے۔"

"آپ چاہتے کیا ہیں؟" — اُس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا — "آپ حضورِ انور بات تو کریں۔ میں آپ کا خادم ہوں۔"

"میں دو چیزیں چاہتا ہُوں" — میں نے کہا — "ایک یہ کہ ناصر علی کے گھر سے اپنے علم کا اثر اٹھا لو۔ دوسرے یہ کہ جس نے تم سے یہ کام کرایا ہے اُس کا نام پتہ بتا دو۔"

"پھر آپ کیا کریں گے؟"

"کچھ بھی نہیں" — میں نے کہا — "ایک شریف گھرانے کو سکون ملے گا۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر انگلیوں پر کچھ گننے لگا۔ گن کر بولا —

"آج کا دن اور کل کا دن۔ اس کی معیاد کل رات ختم ہو جائے گی" — وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا — "آپ اس آدمی کا نام پتہ معلوم کر کے کیا کریں گے؟"

"اُسے صرف یہ سمجھاؤں گا کہ کسی نیک آدمی کو اس طرح تنگ نہیں کرنا چاہیئے" — میں نے جواب دیا اور میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ اس نے آدمی کہا ہے عورت نہیں کہا۔

اُس نے پس و پیش کی۔ اب اس کے انداز میں بزرگی یا پیری فقیری کی ذرا سی بھی جھلک نہیں تھی، بلکہ اُس کا انداز اُن ملزموں کا سا ہو گیا تھا جو اقبالِ جرم سے گھبرایا کرتے ہیں۔

"دیکھو گوگل!" — میں نے کہا — "میں تمہیں صحیح بات بتا دیتا ہوں۔ ہم دونوں خفیہ پولیس کے افسر ہیں اور ناصر علی کے گھر پر جو مصیبت نازل ہو رہی ہے اس کی تفتیش کے لئے آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے تم غیب کا حال جانتے ہو لیکن ہم غیب کا حال جاننے والوں کے دلوں کا حال جانتے ہیں۔ ذرا غور کرو کہ اتنی دُور سے تمہارے گھر تک کس طرح پہنچ گئے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تمہارے خلاف ہمیں قابلِ یقین شہادت ملی ہے۔ ہمارے ساتھ اب صلح صفائی کی بات کرو۔"

وہ جو باتیں اُگل چکا تھا انہیں اب نگل نہیں سکتا تھا۔ دھیمی سی آواز میں بولا — "میں آپ کا کام کر دوں گا۔ آپ کے دشمنوں کا حال ناصر علی کے گھر سے زیادہ بُرا کر دوں گا۔"

"میں اپنا کام بھی بتاؤں گا" — میں نے کہا — "تم اس آدمی

کی نشاندہی کر دو۔"

"کیا یہ جُرم ہے؟" — اُس نے پوچھا — "اس کی سزا مل سکتی ہے؟"

"تمہیں کس نے کہا ہے کہ یہ جُرم ہے اور تمہیں اس کی سزا ملے گی؟" — میں نے کہا — "ہمیں کاغذوں کا پیٹ بھرنا ہے کہ یہ اُلٹے تعویذوں کا اثر ہے جس کی معیاد ختم ہو گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ انبالہ میں پولیس نے اس شک میں چار پانچ بے گناہ آدمیوں کو گرفتار کر لیا ہے کہ ناصر علی کے گھر پتھر پھینکتے ہیں۔ انہیں رہا کرانا ہے۔"

بہت دیر کی جھک جھک، دلیل بازی اور دھمکیوں کے بعد اُس نے نام بتا دیا مگر یہ نام اُس عورت کا نہیں، ایک آدمی کا تھا اور یہ آدمی وہ تھا جس کے ساتھ ناصر علی کی بیوی کی شادی سے پہلے محبت تھی ہم نے گوگل سے وہ باتیں اُگلوا لیں جو وہ اس آدمی کے متعلق جانتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ یہ آدمی اُس کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ وہ شادی سے پہلے ناصر علی کی بیوی کو چاہتا تھا۔ اُس نے گوگل کو محبت کی وہ داستان سنائی جو ہمارے معزز مُخبر ہمیں سنا چکے تھے۔ اُس نے بیوی کے ساتھ بیس سال اس طرح گزارے کہ گھر میں سکون کی بجائے لڑائی جھگڑا رہتا تھا۔ اس نے شراب نوشی شروع کر دی۔ بدمعاش عورتوں کے ساتھ دوستی لگا لی اور شریفانہ زندگی کی راہ سے گمراہ ہو گیا۔

ایک سال گزرا، اُس کی بیوی مر گئی۔ اس کی عمر ابھی چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ابھی بوڑھا نہیں ہوا تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہیں تھی

اس لئے اُس کی صحت جوانوں کی طرح تھی۔ اُس نے طے کر لیا کہ وہ ناصر علی کی بیوی کے ساتھ شادی کرے گا۔ وہ انبالہ سے کبھی کبھی گھر آیا کرتی تھی۔ وہ اُسے ملا اور کہا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس عورت نے حیرت کا اظہار کیا۔ اس آدمی نے اُسے کہا کہ وہ ناصر علی کو اتنا پریشان کرے کہ وہ اُسے طلاق دے دے یا خاوند کو زہر دے دے۔

اس عورت نے اُسے کہا کہ اُس کے دماغ میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا علاج کرائے۔ مختصر یہ کہ وہ اس شریف عورت کے پیچھے پڑا رہا۔ آخری بار وہ یہاں آئی تو اس عورت سے وہ پھر ملا۔ عورت نے اُسے بہت بُری طرح دھتکارا اور کوئی دھمکی بھی دی۔ اس پاگل آدمی نے اُسے کہا کہ جس طرح وہ جل رہا ہے اسی طرح وہ بھی جلتی رہے گی۔ یہ شخص گوگل کے پاس گیا اور اُسے اتنی زیادہ رقم پیش کی جو گوگل نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اُسے شراب کی پانچ چھ بوتلیں بھی دیں اور اُسے کہا کہ وہ ناصر علی کی بیوی کا جینا حرام کر دے۔

گوگل نے ان شریف لوگوں کا جینا حرام کر دیا۔

ہم نے سب انسپکٹر چرن سنگھ سندھو سے کہا کہ وہ اس آدمی کو تھانے بلا کر بٹھا لے۔ میں اور انسپکٹر گرے گوگل کے ساتھ اُس کے ڈیرے پر چلے گئے اور تلاشی لی۔ دو انسانی کھوپڑیاں برآمد ہوئیں۔ انسانی جسم کی کچھ ہڈیاں بھی ملیں۔ سلیٹ اور ایک پوٹلی ملی۔ چرس اور شراب بھی ملی۔ کچھ اور اُوٹ پٹانگ سی اشیاء تھیں۔ گھر میں دو عورتیں تھیں۔ یہ اُس کی بیویاں

تھیں۔ انہیں ہم گوگل کے ساتھ تھانے لے گئے۔ وہ آدمی تھانے میں موجود تھا۔

ہم نے گوگل اور اس کی بیویوں کو برآمدے میں ایک دوسرے سے دُور دُور بٹھا دیا اور گوگل کے سائل یعنی ناصر علی کی بیوی کے ساتھ شادی کرنے والے کو اندر لے گئے۔ وہ پٹے ہوئے تھا لیکن ہوش میں تھا۔ شاید تھانے میں آکر اُس کے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔

"تم فوراً مان لو کہ تم نے گوگل سے کالے علم کا جادو کرا کے ناصر علی کے گھر میں سنگ باری اور آتش زنی کرائی ہے" — میں نے اُسے کہا — "تم نے دیکھ لیا ہے کہ گوگل اپنی بیویوں کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ نہیں بکو گے تو باقی عمر جیل میں پڑے رہو گے .... جلدی بولو"

اتنے خوبرو اور تنومند آدمی نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا — "میں گناہگار ہوں حضور! مجھ پر رحم کریں۔ میرا دماغ خراب ہو گیا تھا"

"میں رحم کا وعدہ کرتا ہوں" — میں نے کہا — "تم بولتے جاؤ"۔

اور وہ بولنے لگا۔ اُس نے وہی کہانی سُنائی جو آپ کو دو مخبروں اور گوگل کی زبانی سُنا چکا ہوں۔ اُس نے کہا کہ میں نے بیس سال جس اذیت میں گزارے ہیں، یہ بڑے سے بڑا جابر مرد بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں بیوی کے ساتھ دل نہیں لگا سکا اور ناصر علی کی بیوی سے کہا کہ وہ میرے ساتھ شادی کر لے۔ میں نے اُسے ناصر علی سے آزاد ہونے کے طریقے بتائے۔ یہ بھی کہا کہ میں اُسے قتل کرا دیتا ہوں لیکن عورت نہ مانی۔

بہت دن ہوئے وہ آئی تو میں نے اُسے اپنے گھر بلایا۔ وہ آ گئی۔ میں نے اُس کے ساتھ پھر وہی ضد کی۔ اُس نے مجھے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے کہا کہ شادی نہ کرو۔ یہ وعدہ کرو کہ جب بھی یہاں آیا کرو گی، مجھے اُسی طرح ملا کرو گی جس طرح شادی سے پہلے ملا کرتی تھیں۔ اُس نے دو ایسی حرکتیں کیں کہ میں جل اُٹھا۔ ایک یہ کہ اُس نے جُوتی اُتار کر مجھے دکھائی۔ پھر میرے مُنہ پر تھوک کر چلی گئی۔

یہ آدمی پاگل ہو گیا اور گوگل کے ہاں گیا۔ گوگل نے اُس کا کام کر دیا۔

ہم نے گوگل اور اس آدمی کو گرفتار کر لیا۔ رات وہیں رہے۔ اگلی صبح دونوں کو اور گوگل کی بیویوں کو انبالہ لے گئے۔ میں اور انسپکٹر گرے ناصر علی کے گھر گئے۔ دوپہر کے بعد کا وقت تھا۔ پتہ چلا کہ اُس روز نہ پتھر آتے ہیں نہ کسی کپڑے کو آگ لگی ہے۔ میں نے ناصر علی کی بیوی کو کمرے میں بٹھایا اور انسپکٹر گرے سے بھی کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ میں نے ناصر علی کی بیوی سے کہا کہ وہ مجھے پولیس آفیسر کی بجائے اپنا بھائی سمجھے۔ میں نے اُسے بتایا کہ مُلزم گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ گوگل کے ساتھ جب میں نے اُس کے چاہنے والے کا نام لیا تو اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں پھر ان ٹھہری ہوئی آنکھوں میں سے آنسو بہنے لگے۔

میں نے اُسے بتا دیا کہ اُس کے متعلق کچھ انکشاف ہوتے ہیں جب میں نے اُسے بتایا کہ اُسے عدالت میں گواہی دینی پڑے گی تو اُس کا

رنگ نمایاں طور پر پھیلا پڑ گیا۔ میں نے اُس کی حوصلہ افزائی کی تو وہ بولی
"میرے خاوند کو یہ تو معلوم ہے کہ میں شادی سے پہلے اس مردود کو چاہتی تھی لیکن میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ یہ شخص اپنی بیوی کے مرنے کے بعد مجھے کیا کہتا رہا ہے"

"اس کی آپ فکر نہ کریں" ––– میں نے کہا ––– "میں آپ کے شہر سے ہو آیا ہوں۔ وہاں کے لوگ آپ کے خاوند اور آپ کے کردار کی جو تعریفیں کرتے ہیں، اُن کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ میں آپ کے خاوند کو سب کچھ بتا دوں گا"

میری حوصلہ افزائی اور ہمدردی نے اثر دکھایا اور اس عورت نے جس کی میں آج بھی قدر کرتا ہوں، اعتراف کیا کہ وہ شادی سے پہلے اس آدمی کو چاہتی تھی۔ اُسے ملتی بھی تھی مگر اس کی شادی ناصر علی کے ساتھ ہو گئی۔ اُسے بہت دُکھ ہوا لیکن ناصر علی نے اُسے ایسی محبت دی کہ وہ شادی سے پہلے کی محبت کو فراموش کرنے لگی۔ ناصر علی نے اُسے کبھی بھی نہ کہا کہ وہ کسی اور کو چاہتی تھی اس لئے اب بھی اُسے ملتی ہو گی۔ یہ ناصر علی کے کردار کا کرشمہ تھا کہ یہ عورت یہ سوچ کر اُس کی باندی بن گئی کہ اُس نے اُسے اغوا نہیں کیا نہ زبردستی شادی کی ہے۔

اُس کا چاہنے والا اُسے ملاقات کے پیغام بھیجتا رہا، مگر اُس نے اس آدمی کو صاف جواب دے دیا اور اسے کہلوا بھیجا کہ وہ اپنی زندگی تباہ نہ کرے۔ یہ عورت ناصر علی کی طرح عبادت گزار ہو گئی۔ بیس سال بعد

اس کے چاہنے والے کی بیوی مر گئی۔ اس کے بعد ناصر علی کی بیوی جب بھی اپنے گھر گئی، یہ آدمی اس سے ملا۔ اس عورت کی نیت صاف تھی اس لئے اُس نے ملنے سے گریز نہ کیا اور اُسے سمجھاتی بجھاتی رہی۔

"میرا خیال ہے کہ اس کا دماغی توازن صحیح نہیں رہا تھا" ––– اس نے کہا ––– "اُس نے مجھے جو کچھ کہا اور جو راستے دکھائے وہ کوئی پاگل ہی دکھا سکتا ہے۔ میں نے آخر اُس کی بے عزتی کی اور اُسے کبھی نہ ملنے کی قسم کھالی"

میں نے ناصر علی سے بات کی اور اُس کی بیوی کے کردار کی تعریف کی۔ اُس نے کہا کہ میری بیوی عدالت میں پورا بیان دے گی.... ہم نے بڑی محنت سے کیس تیار کیا۔ گوگل نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ کالے علم کا عمل کس طرح کرتا ہے۔ ہم نے گواہ بھی تیار کر لئے اور کیس کورٹ میں دے دیا۔ یہ عجیب کیس تھا لیکن تعزیرات ہند میں اس جرم کی سزا موجود تھی۔ گوگل کو سات سال اور اس آدمی کو پانچ سال سزائے قید دی گئی جو ہائی کورٹ نے اُن کی اپیلیں مسترد کرتے ہوئے بحال رکھی۔